

بالشویک انقلاب 1917ء

سلسلہ
اشاعت
کے
42 سال

www.struggle.pk

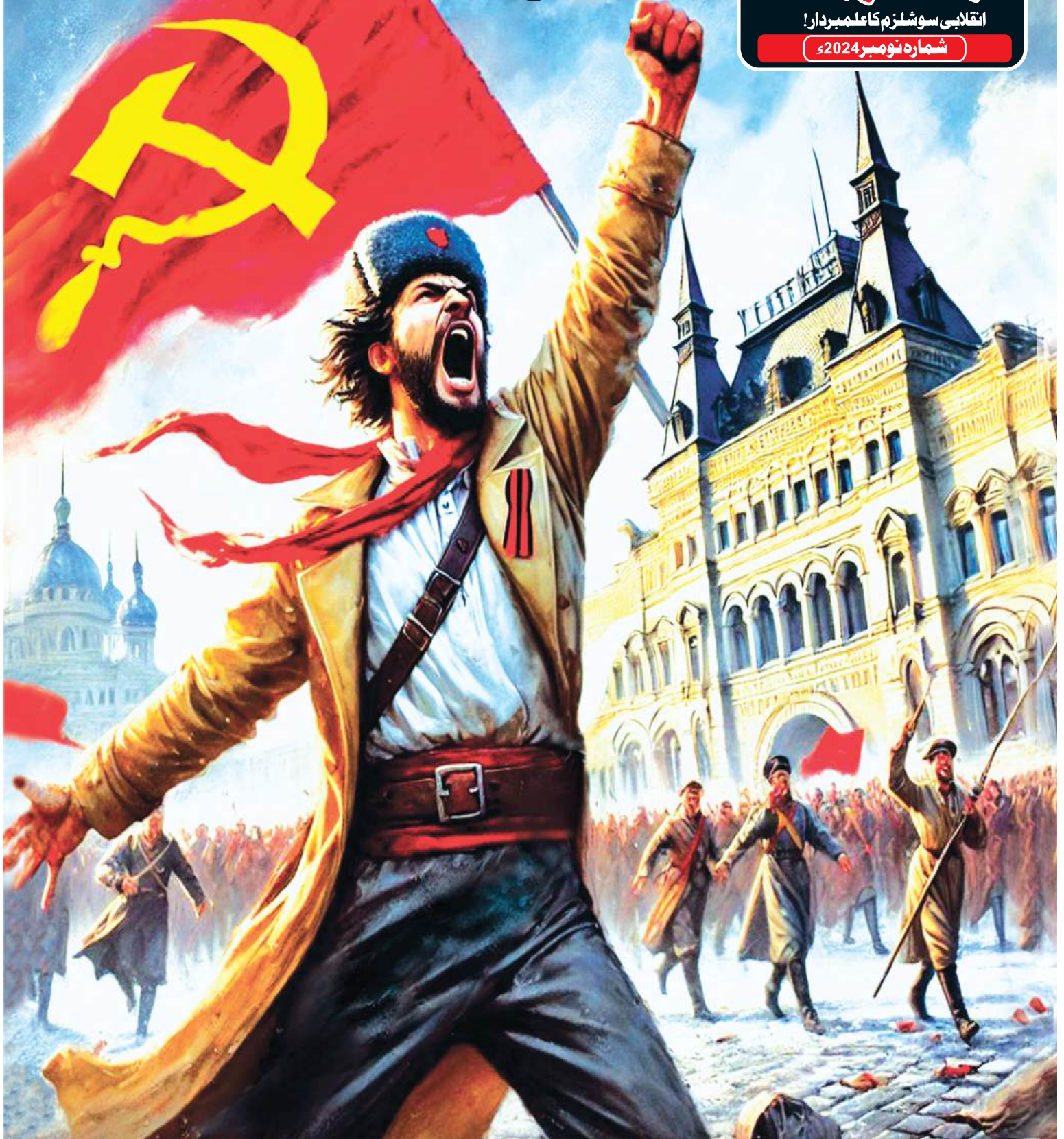
دنیا بھر کے محنت کشوں کے لیے

طبقاتی

جدوجہد

انقلابی سوشلزم کا علمبردار!

شمارہ نومبر 2024ء





ایڈیٹر
رنگ الٹی

قیمت: 100 روپے
یکجہتی قیمت: 500 روپے
سالانہ سکرپشن: 2000 روپے

اداریہ جدوجہد



105 منگل مینشن سیکنڈ فلور رائل پارک لکشمی چوک لاہور

فون: 042-36316214 فکس نمبر: 042-36365659 ای میل: strugglepakistan@gmail.com

مرکزی دفتر

0343-0400318	طبقاتی جدوجہد آفس، کورودت سنگھ روڈ نزد گورنمنٹ ہسپتال سکول کوئٹہ	کوئٹہ
0333-7793396	عبدالرحمن	مستونگ
0337-6298801	حاتم خان لڈ	کراچی
0311-3170038	آفس نزد دہلی شیرمال ہاؤس، سول ہسپتال روڈ حیدرآباد	حیدرآباد
0333-3586031	پرشوتم، طبقاتی جدوجہد آفس نزد پرانا سول ہسپتال میرپور خاص	میرپور خاص
0333-2884809	محمد حسین، P.O. خواجہ ولیچ ڈسٹرکٹ ٹنڈوالہیار	ٹنڈوالہیار
03003272023	انور پنہور، ٹینشن روڈ بھان سید آباد	دادو
0349-3566688	آزاد جماس داس	عمرکوٹ
03013544615	شرجیل شر، پوسٹ آفس ٹھری میرواہ، خیرپور میرس	خیرپور
0308-7172677	قمر الزماں خاں 204/6C الحیات سٹریٹ غفور آباد	صادق آباد
0345-4761547	حیدر چغتائی-45 بانو بازار	رحیم یار خان
0333-6156680	ایڈوکیٹ ندیم پاشا، ضلع کچہری، ملتان	ملتان
0333-6186870	ایڈوکیٹ عبدالرؤف لڈ، تحصیل کورٹس جام پور، ضلع راجن پور	راجن پور
0300-2241860	مزدور کلب بمقابل GPO اقبال پارک	کوٹ ادو
0345-8021007	آفس طبقاتی جدوجہد، لائبریری چوک، ترنڈہ سوائے خان	ترنڈہ
0343-6000482	ایاز بیٹو ایڈوکیٹ، نیو جیوڈیشل کمپلیکس ڈسکہ	ڈسکہ
0308-4931937	ایڈوکیٹ ادیبہ علی	فیصل آباد
0322-8753484	فیاض	قصور
0333-5358516	آفس نمبر A-16، تھرڈ فلور، تاج محل پلازہ، 6th روڈ، راولپنڈی	راولپنڈی
0315-0599951	عبدالحق	فتح جنگ
0342-5548850	طبقاتی جدوجہد آفس، کالج چوک مجیرہ	مجیرہ
0345-9568584	طبقاتی جدوجہد آفس، لوئر پلیٹ نزد سنوکر پبلس	مظفر آباد
0333-5698841, 03459568584	مرکزی سیکریٹریٹ سینڈ فلور گل فائنگ کمپلیکس	راولاکوٹ
0345-3974154	یاسر پینٹ سٹور ہولار پوسٹ آفس تحصیل سہنسہ کوٹلی	کوٹلی
0345-5533174	محمد ایاز خان، ایم ڈی ایس روڈ	باغ
0344-9897418	ایڈوکیٹ غفران احمد، ڈسٹرکٹ بار بٹ خیلہ	مالاکند
03359067135	ساجد ایوب: آفس طبقاتی جدوجہد جنوبی پشتونخواہ ایل جی 30 یونیورسٹی پلازہ بنوں سٹی	بنوں
0343-9618902	صاحبزادہ باچا، کالج کالونی سید وشریف	سوات

BRITAIN
Naeem Khan
213 Billet
Road London
E17 5NS
Britain

NETHERLANDS
Asif Alvi
Admiraal De
Ruyter Weg-83
III 1057 JZ
Amsterdam
Ph:0031-614454298

BELGIUM
Rana Sikander
Prekers Straat
8/1 2000
Antwerpen 1
Belgium
Ph:0032-497069406

یورپ
میں رابطے
کے لئے



اداریہ جدوجہد



امریکہ: زوال پذیر سامراج کے انتشار بھرے انتخابات

گلوبلائزیشن کے اس عہد میں کسی ایک ملک میں ہونے والی سیاسی و سماجی تبدیلیاں ناگزیر طور پر دوسرے خطوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ چاہے وہ ملک بظاہر معمولی معاشی و جغرافیائی اہمیت کا حامل ہی کیوں نہ ہو۔ اس حوالے سے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ پوری دنیا کی نظریں گزشتہ کئی مہینوں سے 5 نومبر کو ہونے والے امریکی صدارتی انتخابات پر کیوں لگی ہوئی ہیں۔ تاریخ کی سب سے بڑی معاشی و عسکری قوت ہونے کے ناتے امریکہ کی داخلی سیاست گزشتہ تقریباً آٹھ دہائیوں سے عالمگیر اہمیت کی حامل رہی ہے۔ لیکن حالیہ عرصے میں بالخصوص 2008ء کے بعد سے عمومی معاشی بحران، عالمی سطح پر طاقتوں کے توازن کی بدلتی کیفیت (چین کے مقابلے میں امریکہ کی نسبی زوال پذیری) اور خود امریکی معاشرت اور سیاست کے بڑھتے ہوئے انتشار نے صدارت کی اس دو گونہ زیادہ متنازعہ اور پتہ بچھ بنایا ہے۔

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو امریکی حکمران طبقے کی قوت اور اعتماد کا اظہار، ملکی سیاست اور ریاست پر اس کے گہرے تسلط (Hegemony) میں ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے ظاہر ہے امریکہ کی بے نظیر معاشی ترقی، گہری اور وسیع صنعتی بنیادیں، تکنیکی جدت، ہولناک عسکری قوت اور عالمی سامراجی غلبے جیسے عوامل کا فرما رہے ہیں۔ ان حالات میں امریکی حکمران طبقہ ٹو پارٹی سسٹم کو اپنے سیاسی اقتدار کے کلیدی اوزار کے طور پر استعمال کرتا آیا ہے۔ امریکہ کی تقریباً تمام سیاسی تاریخ دو حاوی پارٹیوں کی مقابلہ بازی پر ہی مشتمل رہی ہے۔ تاہم یہ ٹو پارٹی سسٹم اپنی موجودہ شکل میں 1850ء کی دہائی کے بعد تشکیل پایا۔ جس میں ریپبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹیاں دو بنیادی اور حاوی سیاسی رجحانات کے طور پر موجود رہی ہیں۔ بورژوا دلائل اور صحافت میں بالعموم ریپبلکن پارٹی کو دائیں، جبکہ ڈیموکریٹک پارٹی کو بائیں بازو میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بہت جعلی اور سطحی قسم کی تقسیم ہے۔ امریکہ کی موجودہ سیاست کی اساس درحقیقت وہی ہے جسے بائیں بازو کا رجحان رکھنے والے نامور امریکی صحافی و دانشور گورو ویدال نے تقریباً پانچ دہائیاں قبل واضح کیا تھا: ”امریکہ میں صرف ایک پارٹی ہے۔ دولت اور ملکیت رکھنے والوں کی پارٹی۔ جس کے دو دائیں بازو ہیں: ریپبلکن اور ڈیموکریٹ۔ آزاد منڈی کی سرمایہ داری کے بارے میں ریپبلکن تھوڑے زیادہ احمق، زیادہ سخت گیر اور زیادہ عقیدہ پرست ہیں۔ ان کے مقابلے میں ڈیموکریٹس نسبتاً دلکش، پرکشش اور تھوڑے سے زیادہ بدعنوان ہیں۔ اور جب غریب، سیاہ فام اور سامراج مخالف عوام قابو سے باہر ہونے لگتے ہیں تو ان کے ساتھ لین دین یا مصالحت (Adjustments) پر بھی زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔ باقی ان دو پارٹیوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق موجود نہیں ہے۔“

اگر غور کریں تو نہ صرف امریکہ بلکہ مغرب کی بیشتر سرمایہ دارانہ دنیا میں دوسری عالمی جنگ کے بعد ایسا ہی ٹو پارٹی سسٹم موجود رہا ہے۔ جس میں غیر معمولی حالات یا استثنائی صورتوں سے ہٹ کے ’آؤٹ سائز ریز‘ کی گنجائش بہت محدود رہی ہے۔ یہ بنیادی طور پر سرمایہ داری کو 1929ء کے بحران سے ہولناک برہادی اور خونریزیوں کی قیمت پر ٹکانے والی جنگ کے بعد کے بڑے منافعوں اور بیش بہا معاشی ترقی کے حالات کا مظہر تھا۔ جس میں سانحہ کودائیں اور بائیں بازو کی روایتی پالیسیوں سے چلانے کی گنجائش موجود تھی۔ ایسے میں مروجہ لبرل آرڈر کا نظریاتی تسلط آج کی نسبت کہیں زیادہ گہرا تھا اور سامراجی حکمران طبقات کے پاس اپنے چند سیاسی نمائندوں کو دہائیوں کی تربیت سے گھاگ اور زیرک بنا کے سامنے لانے اور سیاست پر مسلط کرنے کی بھی خاطر خواہ گنجائش موجود تھی۔

مذکورہ لبرل آرڈر میں پہلی دراڑیں 1970ء کے اواخر سے سرمائے کی شرح منافع میں گراؤ سے پڑنا شروع ہوئیں۔ جنہیں نیولبرل پالیسیوں کے ذریعے بھرنے کی کوشش کی گئی۔ علاوہ ازیں روس اور مشرقی یورپ میں سٹالنزم کے انہدام اور چین میں سرمایہ داری کی بحالی کے آغاز نے بھی مغربی سامراج کو کچھ نظر بیاتی اور معاشی سہارا دیا۔ لیکن اس تاریخی عمل میں 2008ء کا بحران ایک معیاری تبدیلی یا جھٹکا کا غماز مظہر ہے۔ جس نے روایتی سیاست (چاہے وہ بائیں بازو کے سابقہ سوشل ڈیموکریٹک رجحانات ہوں یا دائیں بازو کی لبرل پارٹیاں) کی معاشی بنیادوں کو بڑی ٹوٹ پھوٹ سے دو چار کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 2011ء کے بعد سے دنیا بھر میں جہاں احتجاجی و انقلابی تحریکوں کے ساتھ بائیں بازو کے نئے (اگرچہ بیشتر صورتوں میں اصلاح پسند) رجحانات ابھرے ہیں وہاں ایک کے بعد دوسرے ملک میں پاپولسٹ یا انتہائی دائیں بازو (فار رائٹ) کی پارٹیوں اور شخصیات کا ابھار بھی ہو رہا ہے۔ امریکہ میں اس عمل کا اظہار ڈونلڈ ٹرمپ ہے۔ جو بنیادی طور پر ایک غیر لبرل اور غیر روایتی دائیں بازو کا نمائندہ رجحان ہے۔ ریاست و معاشرت میں گہرے اثر و رسوخ کے باوجود ایسی شخصیات، جو سرمایہ داری کے بحران کا حل زیادہ جلدی، وحشیانہ، جنگ نظر اور بیشتر صورتوں میں نسل پرستانہ پالیسیوں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں، سامراجی نظام کے سنجیدہ پالیسی سازوں کے لئے در سربنی ہوئی ہیں۔

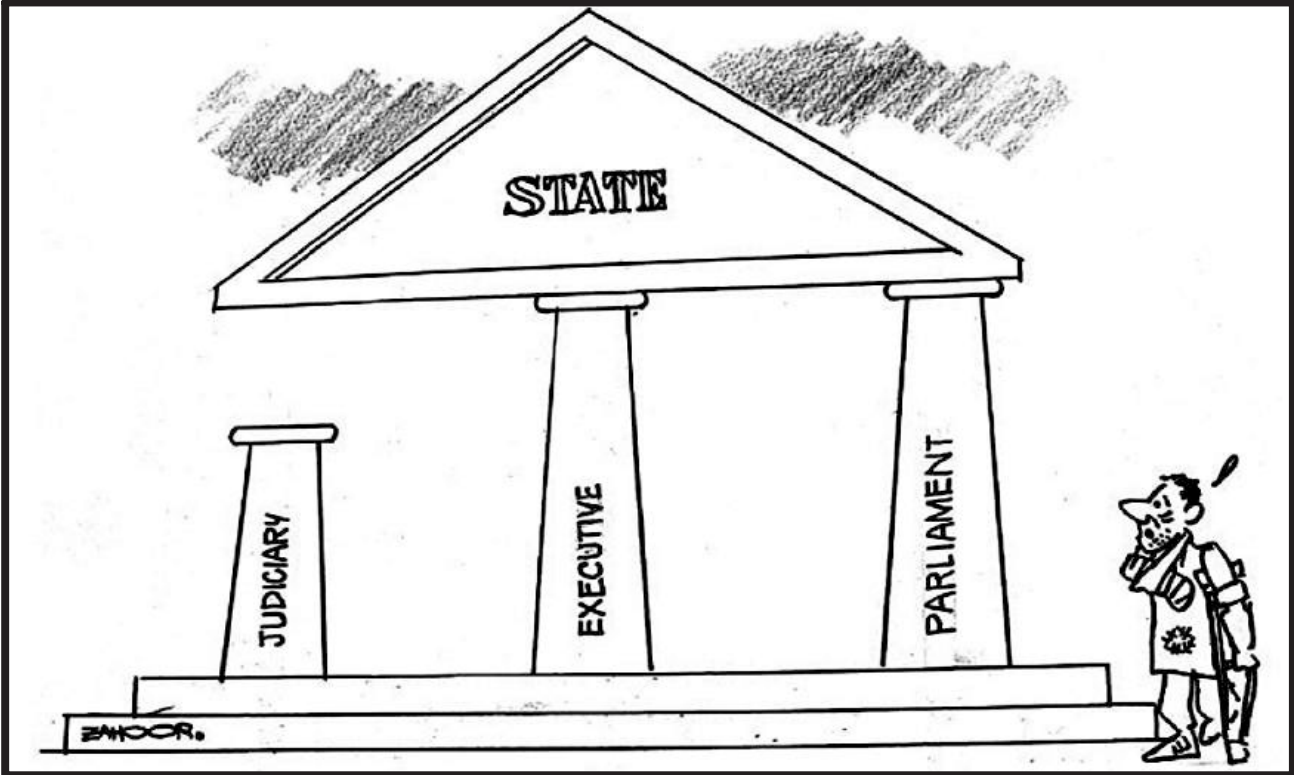
ٹرمپ کی مقبولیت جہاں امریکی سماج میں مسلسل شدت پکڑتی پولرائزیشن اور پیمانہ کا اظہار ہے وہاں وہ اپنے الہامی پن، ڈھٹائی، خود پسندی، بڑھک بازی اور لغویات کہنے پر مبنی رویوں کے ذریعے مکروہ لبرل سامراجی آرڈر پر چڑھے تہذیب، مفاہمت، انسانی حقوق اور جمہوریت وغیرہ کے لمبا دوں کو تار تار کرنے کے درپے ہے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے کہ کئی حوالوں سے نہ صرف ٹرمپ اور عمران خان کی شخصیات کے درمیان مقول موازنہ ممکن ہے بلکہ دونوں کی اقتدار سے بے دخلی کے بعد جنم لینے والے واقعات میں بھی حیران کن حد تک گہری مماثلت موجود رہی ہے۔ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ موجودہ امریکی صدر جو بائیڈن نے واضح تنبیہ کی ہے کہ یہ انتخابات شاید پرامن نہ رہ سکیں۔ اس کیفیت کو 13 جولائی کے واقعے کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جب امریکی معاشرہ ایک مکملہ خانہ جنگی سے اتنا ہی دور تھا جتنی دوری سے گوئی ٹرمپ کی کھوپڑی کے پاس سے گزری تھی۔

ٹرمپ آخری تجربے میں امریکی سامراج کا دوراندیش نمائندہ نہیں بلکہ چیزوں کو دو چار کی زبان میں سمجھنے والا ’دعولی‘ سرمایہ دار ہے۔ جو سامراجی سرمایہ داری کے دور رس اہداف اور عزائم کو اگر حماقت نہیں تو ناواقفیت کا حامل ضرور خیال کرتا ہے۔ اگرچہ نائن سے لے کے برازیل اور امریکہ سے لے کے پاکستان تک ایسے رجحانات کا ابھار جہاں بورژوا اقامت کے بحران کا اظہار ہے وہاں یہ بھی واضح کرتا ہے کہ سرمایہ داری کو پرانے طریقوں سے چلانا محال ہوتا جا رہا ہے۔ امریکی انتخابات کی تکنیکی تفصیلات میں جانے کی بجائے یہ حقیقت ہی کافی ہے جو خطرات کو اس جو بائیڈن کو انتخابی دوڑ سے زبردستی باہر کرنے (درحقیقت لات مار کے نکلانے) اور کمرلا ہیرس کو ایک سیاہ فام خاتون اور نمٹنا چاک و چوبند، حاضر دماغ اور مقبول امیدوار کے طور پر ٹرمپ کے سامنے اتارنے کے باوجود مقابلہ انتہائی کانٹے دار ہوگا۔ موجودہ صورتحال میں اسرائیل کو گام دینے میں ناکامی نے بھی ڈیموکریٹس کی ساکھ کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ بہر حال جہاں ٹرمپ کے جیت جانے کے امکانات موجود ہیں وہاں اپنی شکست کو بھی وہ آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا۔

واقعات کی روش پر صورت میں ایک نئے بحران کی طرف ہی جاتی ہے۔ جو سرمایہ داری کے عمومی کثیر جہتی بحران کا ہی ایک پہلو ہے۔ یہ بنیادی طور پر ایک سماجی نظام کی متروکیت اور پسیدگی ہے جو نسل انسان کو ایک بعد دوسرے انتشار، خونریزی اور اذیت کی طرف لے جا رہی ہے اور جس سے نجات معیشت، معاشرت، سیاست اور ریاست کے موجودہ بندوبست کو ایک انقلابی انداز سے بدلے بغیر ممکن نہیں ہے۔

لکینی ترمیم نہیں انقلابی جراحی چاہیے!

پاکستان



عوام کی حالت زار اور ریاست کی فرسودگی کا تقاضا ہے کہ آئینی ترمیموں کی بجائے انقلابی جراحی سے نظام کہنہ کے کینسر کا خاتمہ کیا جائے۔

تحریر: قمر الزماں خاں

21 اکتوبر کا سورج جب طلوع ہوا تو 26 ویں آئینی

ترمیم پاکستان کے دونوں ایوانوں سے پاس ہو چکی تھی۔ اس ترمیم، جس کو بہت ہی پر اسرار درجہ حاصل تھا، کی گتھیاں سلجھانے میں کئی ہفتے لگ گئے۔ شروع شروع میں تو وزیر اعظم پاکستان اور قانون پاس کرانے والے متحرک وزرا کو بھی نہیں معلوم تھا کہ جس ترمیم کو وہ اپنے اتحادیوں اور دیگر پارٹیوں سے پاس کرانا چاہتے ہیں اس کے اندر کس قسم کی شقیں موجود ہیں۔ لہذا کہا یہ جانے لگا کہ اس ترمیم کے اندر نہ صرف لاپتہ کیے جانے کے عمل کو قانونی درجہ دیا جا رہا ہے بلکہ فوجی عدالتوں کے قیام سمیت قاضی فائز علی کی ملازمت کو کسی نہ کسی طرح تسلسل دینا مطلوب ہے۔ شنیدہ ہے کہ ایک مہینے میں پانچ سے سات کے قریب مختلف مسودہ جات سیاسی پارٹیوں کے سامنے لائے گئے۔ لیکن اس کا حقیقی خاکہ نویس فردغ نسیم ہے۔ اس ترمیم میں سپریم کورٹ کے سربراہ کی تعیناتی کے اختیارات پارلیمنٹ کو دینے کے ساتھ ساتھ آئینی بیج کا قیام بھی شامل ہے۔ ایک لمبی اور تھکا دینے والی مشق

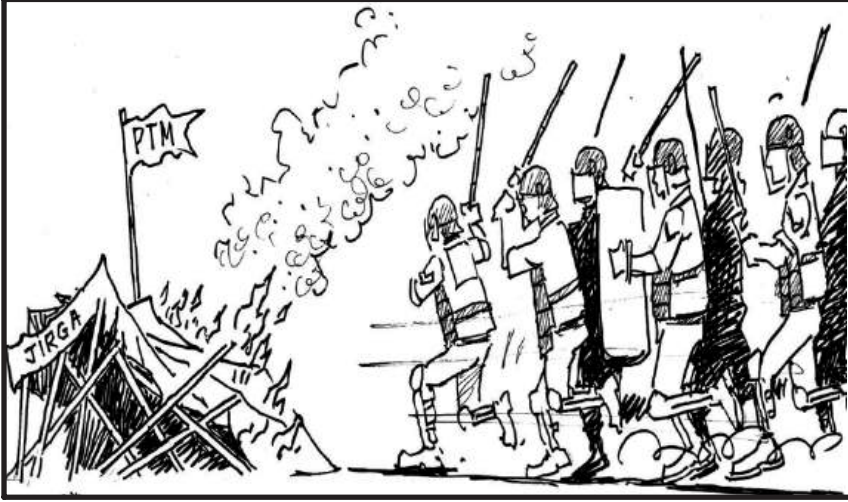
معادلے کی تکمیل کی ہے۔ جبکہ سی او ڈی میں ایک شق نمبر 32 بھی ہے جس میں آئی ایس آئی سمیت تمام خفیہ ایجنسیوں کو حکومتی اداروں کے ماتحت کرنے، خفیہ فنڈز، فوجی بجٹ اور الاٹ شدہ زمینوں کا آڈٹ، حکومتوں کو بھانے اور کارگل جنگ کی تحقیقات سمیت کئی خوفناک نکات شامل ہیں۔ جن کا ذکر تو کیا یہ پارٹیاں تصور کرتے بھی گھبراتی ہیں۔

پاکستان کی ڈیپ سٹیٹ گزشتہ کئی دہائیوں سے بے لگام عدالتی تحریک کو اپنے مقاصد کیلئے اور نام نہاد منتخب حکومتوں کی ٹانگیں کھینچنے، ان کو گرانے اور ذلیل کرنے کیلئے استعمال میں لاتی چلی آ رہی تھی۔ ایک وقت میں اس کھیل میں نواز شریف اینڈ کمپنی بھی پوری طرح شریک کار رہے۔ نواز شریف نے تو ایک بار کالا کوٹ بھی پہنا اور کورٹ پہنچ گیا۔ اگلے وقت میں ڈیپ اسٹیٹ نے ایک نیا ہائی برڈ تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی ضروریات کے تحت نواز شریف کو نکالنے اور ذلیل کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ متوازی طور پر ایک نئی کھیل چلی

کے بعد، جس میں روٹھنے اور منانے کے مضحکہ خیز مناظر بھی شامل تھے، 26 ویں آئینی ترمیم کو حتیٰ شکل نصیب ہوئی۔ اس دوران پسپے سے شرابور بلاول زرداری اور جھاگ اڑاتے مولانا فضل الرحمان اپنے اپنے ساتھیوں کیساتھ شقوں کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ مولانا فضل الرحمان ہمیشہ کی طرح ہر طرف خوب کھیلے۔ کہیں سے طے شدہ منصوبے کے مطابق سارا کریڈٹ مولانا کے کھاتے میں ڈالنے کا سکرپٹ کھیل کو کامیاب بنانے کی کنجی ثابت ہوا۔ مولانا فضل الرحمان کو لگتا ہے کہ انہوں نے 26 ویں ترمیم کے اندر چھپے ہوئے بہت سے سانپ نکال باہر کیے۔ مگر یہ نکالنے کیلئے ڈالے گئے سانپ نہ ہوتے تو پھر اس زیرک سیاست دان کو ٹریپ کرنے کیلئے اس کی اور بھی بھاری شرائط ماننا پڑتی تھیں۔ لہذا مولانا کو جیت کے ہار پہنا کر مطلوبہ نتائج حاصل کر لیے گئے ہیں۔ بلاول اور ن لیگ کو لگتا ہے کہ اس ترمیم کے ذریعے انہوں نے چارٹر آف ڈیموکریسی کے

سیاسی حکمت عملی سے جرگے کا انعقاد ہی ایک پیش رفت ہے۔ جرگے کے مطالبات کی تکمیل کیلئے طے کردہ مدت ہی وہ اصل نکتہ ہے جہاں سے جرگے کے قائدین کا امتحان شروع ہوگا۔

مراکز کھلانے والے شہروں تک پہنچ چکی ہے۔ ماضی کے کنٹرولڈ/نیم کنٹرولڈ بلوچ سردار سیاست سے متروک ہو رہے ہیں۔ جبکہ ایک نئی طرز کی سیاسی تحریک مہرنگ بلوچ کی



مرکزی اور صوبائی حکومت نے پی ٹی ایم پر مکمل پابندی لگاتے ہوئے اس کی تمام سرگرمیوں کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا، معقول مزاحمت اور سیاسی حکمت عملی سے جرگے کا انعقاد ہی ایک پیش رفت ہے۔

کیا ریاست پیچھے ہٹے گی؟ فوج کے قبائلی علاقہ جات سے نکلنے کے مطالبے سے بڑا مطالبہ ان عناصر کی علاقے سے بے دخلی ہے جن کو کبھی ”گند“ قرار دیا گیا، کبھی تذبذباتی اٹھانے مانا گیا اور کبھی انہی کے خلاف آپریشن کیے گئے۔ ان مطالبات کے نہ مانے جانے اور متوقع ریاستی جبری صورت میں عائدین کیا راہ اختیار کریں گے؟ یہ غور طلب سوال ہے۔ بہر حال جرگے کا پانچ روپے پی پی پی کی فراہمی کا مطالبہ پورے پاکستان پر اپنے اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

پچھلے دو سال کی پاور گیم، اکھاڑ پچھاڑ اور پکڑ دھکڑ کے کھیل کے دوران پورا پاکستان اس ٹوٹی پھوٹی سرمایہ داری کے مہلک حملوں کے سپرد ہی رہا۔ تاریخ کی بدترین مہنگائی نے آبادی کے زیادہ بڑے حصے کو غربت کی طرف دھکیل دیا۔ ملک پہلے سے زیادہ مقروض ہو گیا۔ معیشت دیوالیہ پن کی کھائی کے دہانے پر چلے جانے سے عالمی مالیاتی اداروں کی نت نئی شرائط پر مبنی بلیک میلنگ بھی عروج پر رہی۔ آئی ایم ایف کے 25 ویں پروگرام سے پہلے مسلسل بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافہ، نئے ٹیکسوں کے نفاذ اور بجلی کچی رعایتوں کے خاتمے کا انت پھر نئی شرائط پر ہوا۔ نئے معاہدے کے مطابق 17 ارب ڈالر کے توسیعی فنڈز پر 5 فیصد کی بھاری شرح

قیدت میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوان عوام کی ان پرتوں سے اٹھے ہیں جو ماضی میں کم ہی سیاسی تحریک میں نظر آتی تھیں۔ ستم رسیدہ خاندانوں کے خون سے لتھڑے پرچم اٹھائے یہ احتجاجی مارچ وہ طاقتور مظہر ہیں جس نے بہت کم عرصہ میں عوامی مقبولیت حاصل کی اور نئے سیاسی منظر نامے کو تشکیل دینے کیلئے سرگرداں ہیں۔

دوسری طرف پختونخواہ میں ایک عرصے سے جاری سماجی اور سیاسی بے چینی کا مختلف طرح سے اظہار بھی اب نئی طاقت اور نئی شکل میں ہوا ہے۔ پی ٹی ایم کی تمام تر سیاسی و نظریاتی کمزوریوں اور ابہاموں کے باوجود 10 سے 13 اکتوبر تک جاری رہنے والا قومی جرگہ کسی حد تک بالغ نظری پر مبنی مطالبات پر ختم ہوا ہے۔ ان میں فوج اور دہشت گرد تنظیموں کے دوام میں اخراج، بستی بجلی کی فراہمی، لوڈ شیڈنگ کے خاتمے، ڈیورنڈ لائن کے آر پار آزادانہ تجارت اور آمد و رفت، فوجی عدالتوں کے خاتمے اور سیاسی قیدیوں کی رہائی جیسے مطالبات شامل ہیں۔ اگرچہ یہ مطالبات نامکمل ہیں اور پشتون عوام کی معاشی، سیاسی، صفی اور سماجی آزادی کا حتمی فارمولہ انہیں ہیں لیکن ان حالات میں جب مرکزی اور صوبائی حکومت نے پی ٹی ایم پر مکمل پابندی لگاتے ہوئے اس کی تمام سرگرمیوں کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا، معقول مزاحمت اور

عمران خان کو تیسری قوت کے طور پر لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس منصوبے کیلئے خفیہ ایجنسیوں، مقتدرہ کیلئے کام کرنے والے ”ایلیٹ ایبلز“ اور عدلیہ کو پوری شدت سے استعمال میں لایا گیا۔ یہاں دھڑوں سے لے کر عدالتوں کے ریمارکس اور فیصلوں تک جو کچھ ہوتا رہا وہ پاکستان اور اس کی جوڈیشل تاریخ کا ایک اور سیاہ باب تھا۔ اگرچہ عمران خان پراجیکٹ کو کئی ادوار کا اقتدار دینے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی لیکن نہ تو اس نظام میں اتنی گنجائش تھی کہ وہ کسی بھی حکومت کو بہت زیادہ طوالت اور کامیابیاں بخشے۔ نہ ہی عمران خان اور اس کے ساتھیوں کے پاس کھنہ نظام چلانے کی صلاحیت تھی۔ لہذا منصوبہ شروع ہوتے ہی کھٹائی میں پڑ گیا۔ جیسے تیسے اقتدار دلانے کے بعد کے ساڑھے تین سال کی تجالت، ناکامیوں اور بدعنوانیوں کے بعد اس منصوبے کو بند کرنے کا کام شروع ہوا۔ جس میں جہاں بے پناہ وسائل اور دولت سے کرایا گیا شہرت کا سفر رکاوٹیں پیدا کرنے کا باعث بنا وہاں اس ذہن سازی کو الٹانا بھی دشوار ہو گیا جو سالوں سے کی گئی تھی۔ جس میں دیگر سیاسی پارٹیوں اور افراد سے نفرت اور عمران خان کیلئے ہر جائز و ناجائز کرنے کی تربیت کی گئی تھی۔ کسی مہلک وائرس کی طرح شکلیں بدل بدل کر نمونے پانے والی سوشل میڈیا ٹیموں سے لے کے خفیہ اداروں کے اہلکاروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مختلف صفوں میں موجود افراد اور فدائی ججوں کے خاندانوں تک ناقابل کنٹرول عوامل کو واپس کرنے میں دو سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔

26 ویں ترمیم اسی مہم کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعے عمران خان کے حق میں فدائی ججوں کے تحریک پر کنٹرول پانا مطلوب ہے۔ اس ترمیم میں ججوں کی تقرری کا ایک پرچہ طریقہ کار دراصل ان کو کنٹرول میں رکھ کر استعمال کرنے کیلئے ترتیب دیا گیا ہے۔ لیکن اسے استعمال کرنے کی طاقت کس کے ہاتھ میں ہوگی اس کا فیصلہ قوتوں کا توازن مختلف طریقوں سے کیا کرے گا۔ ججوں کے من پسند چناؤ کے طریقہ کار اور الگ سے آئینی بیج کی تشکیل کے باوجود ریاست کے اندر کی گہری دراڑوں اور نظام کی فرسودگی کی موجودگی میں سیاسی، آئینی اور انتظامی استحکام کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے۔

جہاں تک سیاسی بے چینی کا تعلق ہے تو اس کو بالائی سطح سے درست کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ سطح کے اندر بہت گہرے مسائل پچھلی کئی دہائیوں سے مسلسل بڑھتے اور پھیلنے جا رہے ہیں۔ بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کی مسلح بغاوت، بلوچستان کی جغرافیائی باؤنڈری سے نکل کر کراچی جیسے معاشی

کے شعبوں کے اعداد و شمار پاکستان کو ایک غیر صحت مند اور بحران زدہ ریاست قرار دیتے ہیں۔ شکار پور سے لے کر لاڑکانہ، سکھر، کندھ کوٹ، کشمور، گھوٹکی، رحیم یار خاں اور راجن پور تک کے اضلاع کچے کے ڈاکوؤں اور اغوا کاروں کے رحم و کرم پر ہیں۔ ریاستی رٹ قانون نافذ کرنے والے اداروں اور ڈاکوؤں کے تعلقات کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔ بدست بنیاد پرست گروہ کسی توہین کا فتویٰ عائد کر کے سٹریٹ جنٹس شروع کر دیتے ہیں۔

یہ حالات ایک طرح کی حکمران طبقے کی بیگانگی کا مظہر بھی ہیں۔ جو خود کو کروڑوں لوگوں کی ہولناک زندگیوں سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد حکمران طبقے کی اس سفاکی اور بے مہری کو سمجھ رہی ہے۔ آبادی کے ایک حصے کا تحریک انصاف کی طرف مائل ہونا بھی دراصل گہرے اضطراب، غصے اور شدید رد عمل کا نتیجہ ہے جس میں وہ تحریک انصاف کی اہلیت اور ساکھ پر کھنے کی بجائے پہلے سے موجود حکمران گروہوں کے جرائم پر اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہیں۔ پاکستان کے مختلف حصوں، کشمیر اور گلگت بلتستان میں ابھرنے والی قومی اور طبقاتی تحریکوں کو الگ تھلک نبرد آزمائی سے نکل کر نظام کی تبدیلی کے بنیادی ایجنڈے پر خود کو مجتمع کرنا ہوگا۔ سرمایہ داری اور طبقاتی تفریق کے خاتمے سے ہی ایسے عوامل کی تشکیل ممکن ہے جن کے ذریعے قومی، طبقاتی، علاقائی، صنفی، مذہبی اور دیگر بنیادوں پر ہونے والے

پیداواری شعبے میں مطلوبہ ترقی نہ ہو سکی بلکہ عالمی سرمایہ داری کے بحران، جنگوں اور داخلی طور پر عدم استحکام کے باعث جی ڈی پی کی شرح نمو 0.25 فیصد تھی جواب 2.38 قرار دی جا رہی ہے۔ جبکہ آبادی بڑھنے کی شرح 1.9 فیصد تک ہو چکی ہے۔ پاکستان کے حالات کی وجہ سے ہر روز یہاں سے دوسرے ممالک ہجرت کر جانے والوں کی تعداد تقریباً چار ہزار تک ہو چکی ہے۔ یہ انسانی صلاحیتوں اور مہارتوں کا بے نظیر ضیاع ہے۔

پاکستان کے دوشہر کراچی اور لاہور ڈھائی کروڑ کی آبادی کے حامل ہیں جبکہ مجموعی طور پر دس بڑے شہروں کی آبادی دس کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ آدھی سے زیادہ آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزار رہی ہے۔ بیماریاں اور معذوریات بڑھتی جا رہی ہے۔ زیادہ تر بیماریاں گندہ پانی پینے کی وجہ سے ہوتی ہیں جبکہ 40 فیصد اموات کی وجہ بھی گندہ پانی ہے۔ ہر سال 53 ہزار بچے پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی آلودہ پانی پینے سے چل بستے ہیں۔ دنیا بھر میں شوگر کے مریضوں کے حساب سے پاکستان پہلے نمبر پر ہے۔ ہر سال ڈیڑھ لاکھ افراد کے اعضا فاسیٹس کی وجہ سے کاٹے جاتے ہیں۔ ذہنی دباؤ اور ہیجان کی وجہ سے امراض قلب بھی بڑھتے جا رہے ہیں اور 29 فیصد اموات اس وجہ سے ہوتی ہیں۔ صحت اور تعلیم کے صوبائی و وفاقی بجٹ شرمناک حد تک ناکافی ہیں۔

سے سود وصول کیا جائے گا۔ آئی ایم ایف کی بورڈ میٹنگ سے قبل حکومت کو 11 فیصد شرح سود سے ایک غیر ملکی بینک سے چھ سو ملین ڈالر کا قرضہ لینے پر مجبور کیا گیا۔ 1.8 ٹریلین روپے کے اضافی ٹیکس لگوائے گئے۔ بجلی کی قیمت میں 51 فیصد



اضافہ کرایا گیا۔ زرعی انکم ٹیکس کی شرح ساڑھے 12 فیصد کی بجائے 45 فیصد کی گئی۔ اس طرح تقریباً 12 سخت شرائط رکھی گئیں۔ حکومت 4.2 فیصد بجٹ سرپلس دکھانے کی پابند ہو گی ورنہ ٹیکس دہندگان پر جی ڈی پی کا 3 فیصد اضافی ٹیکس لگے گا۔ اسی طرح 25 اداروں کی جنکاری اور صحت اور تعلیم کو پبلک سیکٹر سے نکالنے کے عمل کو تیز کرنے اور بجلی کی تقسیم کار کمپنیوں کی فروخت ایجنڈا پر ہے۔

دوسری طرف اس ملک میں نہ صرف دو کروڑ ساٹھ لاکھ بچے پرائمری تعلیم کے عمل سے باہر ہیں بلکہ یونیورسٹیوں کے فنڈز بند ہونے کی وجہ سے کئی ماہ سے اساتذہ کی تنخواہیں رکی ہوئی ہیں۔ آئی پی بی اور پاور سیکٹر کے تمام حصوں میں ناقص پالیسیوں کی وجہ سے گردشی قرضے ہر سال بڑھتے جا رہے ہیں۔ دیار غیر میں مشکل حالات میں کام کرنے والے مزدوروں کی بھیجی گئی تقریباً تین ارب ڈالر ماہانہ کی رقم ہی زرمبادلہ کا حقیقی ماخذ ہے۔ ورنہ تجارتی عدم توازن اور کرنسی کی بے قدری کے باعث صرف قرض لے کر ہی سود اور قرض کی ادائیگی واحد طریقہ بچا ہوا ہے۔ یہ قرض ایک گھن چکر ہے جو نئے استحصالی معاہدوں، تلخ شرائط، مہنگائی اور بلیک میلنگ کے ساتھ عدم استحکام کو بڑھاتا جاتا ہے۔

پچھلے عرصے میں پاکستان کے صنعتی اور زرعی



استحصال اور بے انصافی کا خاتمہ کرتے ہوئے تمام وسائل کو بہتر انسانی زندگی کی تعمیر کے لئے بروئے کار لایا جاسکے گا۔ عوام کی حالت زار اور ریاست کی فرسودگی کا تقاضا ہے کہ آئینی ترمیموں کی بجائے انقلابی جراحی سے نظام کہنہ کے کینسر کا خاتمہ کیا جائے۔

صحت کا انفراسٹرکچر ہولناک حد تک بوسیدہ ہے۔ دس ہزار انسانوں کیلئے آٹھ ڈاکٹر اور پانچ نرسز جبکہ دو ہزار لوگوں کیلئے محض ایک بستر دستیاب ہے۔ حکمران طبقہ اس صحت کے نظام کو بھی نجی تحویل میں دینا چاہتا ہے۔ تعلیم، روزگار، سڑکوں اور ٹرانسپورٹ، زراعت، صنعت اور موسمیات و ماحولیات

مشرق وسطیٰ میں جیسا کہ حرام: صورتحال اور امکانات

عمران کا میاں

(زیر نظر مضمون 9 اکتوبر کو انگریزی زبان میں 'ایشین مارکسٹ ریویو'، انٹرنیشنل سوشلسٹ لیگ اور دوست تنظیموں کی دوسری ویب سائٹوں پر شائع ہوا۔ جس کے بعد سے حماس کے رہنما یحییٰ سنوار کے قتل سمیت غزہ اور لبنان میں اسرائیل کی بے دریغ وحشت اور دہشت گردی کا سلسلہ جاری ہے۔ مضمون میں مشرق وسطیٰ کے موجودہ حالات کے پس منظر، تازہ صورتحال اور مستقبل کے امکانات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔)



17 اکتوبر 2023ء سے مشرق وسطیٰ میں ابھرنے والا نیا بھونچال نہ صرف تھکنے کا نام نہیں لے رہا بلکہ تباہی اور خوریزی کی شدت اور وسعت میں مزید اضافے کے امکانات بھی اپنی پراختیاد اور تضادات سے بھرپور کوکھ میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مشرق وسطیٰ کی واحد فکشنل 'جمہوریت' اسرائیل کا وزیر اعظم نتن یاہو، جو بنیادی طور پر ایک چھٹا ہوا سامراجی بد معاش، عادی جنگی مجرم اور کٹر صیہونی ہے، ششے کے برتنوں کی دکان میں گھسے بدست گینڈے کی طرح اشتعال انگیزی، شرارت اور بربادی کی ہر حکو عبور کرنے پر تیار ہوا ہے۔ حالیہ جارحیت کے پہلے صرف چھ مہینے کے دوران صیہونی ریاست غزہ پر 70 ہزار ٹن بارود برسا چکی تھی جو پوری دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانیہ اور جرمنی کے بڑے شہروں پر ہونے والی مجموعی بمباری سے زیادہ بنتا ہے۔ اس کے بعد سے اب تک کے تقریباً چھ مہینوں کے دوران برپا کی جانے والی وحشت اس سے زیادہ ہی ہوگی۔ جس نے سکولوں، ہسپتالوں، رہائشی عمارتوں اور دوسرے بنیادی انفراسٹرکچر سمیت غزہ کی پٹی کو عملاً طے کے ایک ڈھیر میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

پچھلے 12 مہینوں کے دوران 43 ہزار سے زائد فلسطینی اسرائیلی افواج کی فضائی بمباری اور زمینی کارروائیوں میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ جن میں سے (انتہائی محتاط اندازوں

سائے ہی نہیں بلکہ ان کی پوری آشیر باد، معاونت اور پشت پناہی سے ہو رہا ہے۔ لیکن مسئلہ صرف اتنا بھی نہیں ہے۔ نیتن یاہو کی پوری کوشش ہے کہ صیہونی یلغار کو ہر ممکن حد تک پھیلا کے ایک بڑی علاقائی جنگ میں بدلا جائے۔ رواں سال اپریل میں دمشق (شام) میں ایرانی سفارتخانے پر حملہ، جولائی میں تہران میں حماس کے قائد اسماعیل ہانیہ کا قتل، حالیہ ہفتوں میں حزب اللہ کے موصلاتی آلات میں دھماکے، دارالحکومت بیروت اور ملک کے جنوبی علاقوں سمیت لبنان پر فضائی حملوں میں شدت (جس میں تین دہائیوں سے حزب اللہ کے سربراہ حسن نصر اللہ سمیت تنظیم کے کئی اہم رہنماؤں کو بھی قتل کر دیا گیا) اور اب جنوبی لبنان پر زمینی چڑھائی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان حالیہ کارروائیوں کے نتیجے میں لبنان میں ہلاکتوں کی تعداد پہلے ہی دو ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ جبکہ دس لاکھ لوگ ہجرت پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جس وقت یہ سطور تحریر کی جارہی ہیں اسرائیل مرکزی بیروت پر بمباری کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے اور ہلاکتوں کی تعداد مسلسل

کے مطابق بھی 90 فیصد عام شہری جبکہ 60 فیصد سے زائد بچے، بوڑھے اور خواتین ہیں۔ آسفیم کے مطابق یہ حالیہ تاریخ کے کسی بھی تنازعے میں مارے جانے والے انسانوں میں خواتین اور بچوں کی سب سے بلند شرح ہے۔ ہلاک ہونے والوں میں تقریباً ڈیڑھ سو صحافی اور 225 امدادی سرگرمیاں انجام دینے والے کارکنان بھی شامل ہیں۔ زخمی یا عمر بھر کے لئے اپاہج ہو جانے والے تقریباً ایک لاکھ افراد اس کے علاوہ ہیں۔ مزید برآں صیہونی جارحیت کے نتیجے میں بالواسطہ وجوہات (علاج معالجے کی عدم فراہمی، غذائی قلت وغیرہ) سے ہونی والی ہلاکتوں کو شمار کریں تو جانی نقصان اس سے کئی گنا بڑھ سکتا ہے۔ برطانوی جریدے 'لائسنٹ' کے مطابق فلسطینی ہلاکتوں کی تعداد ایک لاکھ 86 ہزار بنتی ہے۔ امریکی آبادی میں اگر اس شرح سے ہلاکتیں ہوں تو ان کی تعداد دو کروڑ 80 لاکھ ہوگی!

یہ نہ رکنے والا قتل عام جمہوریت اور انسانی حقوق کی علمبردار مہذب سرمایہ دارانہ دنیا کے رکھوالوں کی نظروں کے

بڑھ رہی ہے۔ انتہا درجے کی سرد مہری، اشتعال انگیزی اور ڈھٹائی پر مبنی صیہونی ریاست کی یہ کاروائیاں اس قدر غیر متوقع اور اچانک رہی ہیں کہ شاید حماس اور حزب اللہ کے قتل ہونے والے مرکزی رہنما خود بھی اپنی ہلاکتوں کی توقع یا پیش بینی سے قاصر تھے۔ بلکہ کئی صورتوں میں تو اسرائیل کی پشت پناہ مغربی سامراجی ریاستیں بھی تذبذب، حیرانی اور ”شاک“ پر مبنی کیفیت کا شکار نظر آتی ہیں۔ جس میں خود امریکی سامراجی انجیلشمنٹ کے پیشتر حصے بھی شامل ہیں۔

سوال یہ بھی ہے کہ آخر نیتن یاہو کا ٹولہ خود سامراجی ورلڈ آرڈر کی تمام تر اخلاقیات، قوانین اور حدود کو پامال کرنے پر کیوں بضد ہے۔ عالمی منظر نامے میں سلگتے بین السامراجی تصادات، اسرائیل کی داخلی سیاست اور مغربی سامراج بالخصوص امریکہ کے اپنے داخلی بحران اور زوال پذیری کو مد نظر رکھے بغیر اس پھیلے کوسلجھنا ممکن نہیں ہے۔ ہم نے اپریل 2024ء کی ایک تحریر میں معاملے کے بنیادی پہلو اور آگے کے امکانات کا احاطہ کچھ ان الفاظ میں کیا تھا:

”حماس کو کچلنے میں ناکام نیتن یاہو... اب غزہ میں جاری قتل و غارتگری کو ایران کیساتھ ایک کھلی جنگ کی صورت پر ورے خطے میں پھیلانے کے درپے ہے۔ کیونکہ مسلسل جنگی حالات ہی اس کے اقتدار میں رہنے کی ضمانت ہیں۔ بصورت دیگر کرپشن کے سنگین مقدمات بھگت رہا ہوگا۔ لیکن اس بنیادی مقصد سے ہٹ کے بھی امریکہ سمیت مغربی سامراج کو خطے میں براہ راست مداخلت اور اسرائیل کی بھرپور پشت پناہی پر مجبور کرنے، غزہ میں جاری بربریت سے دنیا کی توجہ ہٹانے اور ایران کے ایٹمی پروگرام کو تباہ کرنے جیسے عزائم اسرائیل کی حالیہ اشتعال انگیزیوں کے پیچھے کا فرما ہیں... اس صورت میں ممکنہ جنگ کے بالکل بے قابو ہو کر نہ صرف سارے مشرق وسطیٰ بلکہ اس سے باہر بھی پھیل جانے، ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال، خطے کی رجعتی اور عوام دشمن ریاستوں کے خلاف لوگوں کا غم و غصہ بغاوتوں کی شکل میں پھٹ پڑنے اور پہلے سے زبوں حالی کا شکار عالمی معیشت کے گہرے بحران میں دھکیلے جانے جیسے خدشات کے پیش نظر تمام سامراجی طاقتیں بشمول امریکہ، یورپ، روس اور چین اسرائیل کو مزید کسی اشتعال انگیزی سے منع کر رہی ہیں۔ لیکن یہ انتباہ، تاکیدیں اور اپیلیں نیتن یاہو کے باز رہنے کی ضمانت نہیں ہیں۔“

صیہونی ریاست کا بحران

یہ درست ہے کہ ملک کے اندر یا باہر خود پر کسی حملے کی صورت میں انسانی جان و مال کی قیمت سے قطع نظر کئی گنا، بلکہ درجنوں گنا سخت جواب دینا اسرائیل کی پرانی پالیسی رہی ہے۔

لیکن اگر ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھیں تو یہ ساری صورتحال صیہونی ریاست کے اپنے داخلی بحران اور ملک کی سیاسی و نظریاتی سمت کو لے کے اسرائیلی سماج میں موجود گہری تقسیم کے ناگزیر نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ایک طرف مڈل کلاس یورپی یہودیوں وغیرہ پر مبنی آبادی کے وہ سیکولر، لبرل حصے ہیں جو صیہونی ریاست کو ایک جمہوری اور ’یورسٹ‘ معاشرے کے طور پر آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف فلسطینی زمینوں کو ہتھیلانے والے قبضہ گیر، نوآبادکار اور قدامت پرست سماجی دھڑے ہیں جو اپنے قدیم مذہبی صحیفوں کی تعلیمات اور پیش گوئیوں کی روشنی میں اسرائیل کو ایک یہودی تھیوکریٹک ریاست میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے لئے وہ اسرائیل کے جغرافیائی پھیلاؤ، ہمسایہ خطوں پر قبضے، فلسطینیوں کی نسل کشی اور بے دخلی کی ہر حد تک جانے کو تیار ہیں۔

گزشتہ ایک ڈیڑھ دہائی کے دوران موخر الذکر رجحانات کا اثر و رسوخ ملک کی سرکاری مشینری اور سکیورٹی اسٹبلشمنٹ میں تیزی سے بڑھنے کی طرف گیا ہے اور اسرائیلی ریاست دائیں بازو کی طرف جھکتے چلے جانے کے مسلسل عمل کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ رجعتی اور وحشی ہوتی گئی ہے۔ اس صورتحال کو دنیا بھر میں ’فار رائٹ‘ کے ابھار کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نتیجتاً اس وقت نیتن یاہو کے اتحادیوں، حکومتی اہلکاروں اور کابینہ میں بیٹھے لوگوں (ڈیپیل ہاگاری، یوفا، گیلنٹ، بن گوریر، بیزال سمورچ وغیرہ) کو صیہونی داعش یا طالبان کہا جائے تو یہ قطعاً کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ نیتن یاہو سمیت یہ پورا ٹولہ تاریخی صیہونی پراجیکٹ کو زیادہ جبر سے لاگو کرنے اور اسرائیلی ریاست کو ایک زیادہ فسطائی ساخت اور ہیئت میں ڈھالنے کے درپے نظر آتا ہے۔ جس میں جمہوری آزادیوں پر قدغین اور عدلیہ کے اختیارات کو محدود کرنے جیسے اقدامات بھی شامل ہیں۔ اس سارے عمل کے خلاف اپوزیشن کی نسبتاً لبرل پارٹیوں اور عام اسرائیلی شہریوں کی مزاحمت اور ایجنڈیشن بھی احتجاجی مظاہروں کی شکل میں جاری رہی ہے۔ 17 اکتوبر کے واقعات نے اس سلسلے کو اگرچہ وقتی طور پر منقطع کر دیا اور ملکی دفاع و وطن پرستی کے جذبات غالب آ گئے۔ لیکن تلخ معاشی حالات اور مسلسل غیر یقینی صورتحال میں یہ تصادات دوبارہ بھڑک رہے ہیں۔ جس کا اظہار حماس کے قبضے میں موجود اسرائیلی قیدیوں کی ہلاکتوں کے نتیجے میں نیتن یاہو کے خلاف ہونے والے پرتشدد مظاہروں اور یکم تمبر کو ہونے والی آٹھ گھنٹہ کی عام ہڑتال کی شکل میں ہوا ہے (جسے سپریم کورٹ کے ذریعے ختم کروایا گیا) اور آگے اس سے بھی زیادہ شدت سے ہو سکتا ہے۔

اسرائیلی معیشت کی حالت بھی بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ پچھلے سال کے صرف آخری تین مہینوں کے دوران

معیشت کا حجم 20 فیصد سکڑا ہے۔ یہ بڑی معاشی گراؤٹ ہے جو وقتی بحالی کے باوجود موجودہ حالات میں جاری ہی رہے گی۔ فی کس جی ڈی پی اور آمدن کے اعتبار سے اسرائیل اگرچہ ایک بڑے معاشی حجم کا حامل امیر ملک ہے اور تکنیکی حوالے سے بھی خاصا ترقی یافتہ ہے۔ لیکن یہ ساری ترقی و خوشحالی بڑی حد تک مغربی سامراج، بالخصوص امریکہ کی امداد و سرمایہ کاری کی محتاج ہے۔ واضح رہے کہ اسرائیل تاریخی طور پر امریکی امداد کا سب سے بڑا وصول کنندہ ہے جو 1946ء سے اب تک 300 ارب ڈالر سے زائد امداد کی مد میں وصول کر چکا ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے امریکہ ہر سال چار تا پانچ ارب ڈالر اسرائیل کو صرف عسکری امداد کی مد میں ادا کرتا ہے۔ جبکہ اس سال تقریباً 13 ارب ڈالر اس مد میں ادا کیے جائیں گے۔ ایک کروڑ سے بھی کم آبادی کے ملک کے لئے یہ بہت بڑا مالیاتی حجم بنتا ہے۔ لیکن مسلسل اور براہ راست جنگ کے حالات بڑی سے بڑی معاشی طاقت کو بھی ناقابل برداشت خساروں اور قرضوں میں مبتلا کر کے باندھے رکھ سکتے ہیں۔

ایس این ڈی اور نمو پر جیسے اداروں نے ایران کے یکم اکتوبر کے میزائل حملے کے بعد اسرائیل کی کریڈٹ ریٹنگ میں کمی کی ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ جنگ اگر جاری رہتی ہے تو اس کی قیمت جی ڈی پی کے 10 فیصد تک بھی جاسکتی ہے۔ موجودہ حالات میں بہت سے سرمایہ دار اپنا سرمایہ اسرائیل سے باہر منتقل کرنے کی طرف بھی جا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ امریکی سامراج، اسرائیلی صیہونی ریاست کو مشرق وسطیٰ میں اپنی چوکی، بلکہ شاید اپنی ’ایکسٹینشن‘ کے طور پر دیکھتا ہے اور ہر حالات میں اسے تیل آؤٹ کرنے کو تیار ہوگا۔ لیکن حالات زیادہ خراب ہوتے ہیں تو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ سرمایہ درکار ہوگا جس کی فراہمی عالمی سرمایہ دارانہ معیشت کے عدم استحکام کے موجودہ حالات میں یقیناً آسان نہیں ہوگی۔

صیہونی ریاست کے بحران کا ایک اور پہلو عالمی سطح پر اس کی بڑھتی ہوئی تنہائی بھی ہے۔ خود مغربی سامراجی انجیلشمنٹ کے کھلاڑی اور پسماندہ خطوں میں ان کی کٹھ چتلیاں اسرائیل کے حق میں تمام تر بڑھک بازی یا اس کے جرائم پر خاموشی کے باوجود نیتن یاہو کی روش سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اس صورتحال کا اظہار اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں نیتن یاہو کی حالیہ تقریر کے دوران بھی ہوا۔ جہاں پیشتر مندوبین کے واک آؤٹ کے بعد اسے خالی کرسیوں سے خطاب کرنا پڑا۔ اگرچہ مخصوص فرعونی لہجے میں اس کی بکواس مسلسل جاری رہی۔

باقی مضمرات کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں بڑی جنگ ناگزیر طور پر پہلے سے زبوں حال عالمی معیشت پر انتہائی مضر

لیکن پھر دنیا کی سب سے بڑی معاشی اور عسکری قوت اور واحد سپر پاور کے سربراہ کی اپنی حالت پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو ایک انسانی شکل میں مذکورہ سامراجی ورلڈ آرڈر کی زندہ لاش معلوم ہوتا ہے۔ جسے آئندہ امریکی صدارتی انتخابات کی دوڑ سے نکالنے کے لئے پہلے منت ساجت سے کام لینے کی کوشش کی گئی لیکن آخر کار تقریباً لات مار کے باہر کرنا پڑا۔ یہ بھی کیسی مضحکہ خیز قسم کی ستم ظریفی ہے کہ کم از کم شروعات میں ڈیموکریٹک پارٹی کی اسٹیبلشمنٹ سنجیدگی سے جو بائیڈن کو ڈونلڈ ٹرمپ کے مقابلے میں اتارنے کا سوچ رہی تھی۔

لیون ٹرانسکی نے مختلف تاریخی ادوار اور نظاموں کی اہم شخصیات (چاہے ان کے بیچ زماں و مکاں میں سینکڑوں سال اور ہزاروں میل کا فاصلہ ہی کیوں نہ ہو) کی ثقافتی و نفسیاتی مماثلت پر تبصرہ کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ ایک جیسے حالات انسانوں کو ایک جیسا رد عمل دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور حالات کا جبر جتنا شدید ہوتا ہے انسانوں کے پاس مختلف طرز عمل اپنانے کی گنجائش اتنی ہی محدود ہوتی ہے۔ اس تناظر میں جو بائیڈن کا موازنہ بالکل بجا طور پر لیونڈ برٹنیف سے کیا جاسکتا ہے۔ جو سوویت یونین میں سٹالینزم کی زوال پذیری اور سٹالینٹ پیور کریسی کے خود اپنے نظام کے اوپر بڑھتے ہوئے عدم اعتماد کا شخصی اظہار تھا۔ اس کے بڑھاپے، بھلکرو پن اور مضبوط الحواسی کو لے کے سوویت یونین میں کئی سیاسی لطیفے مشہور تھے۔ جن میں سے ایک کے مطابق جب برٹنیف نے اپنی تقاریر لکھنے پر معذور پارٹی عہدیدار کو ڈانٹا کہ میں نے تمہیں پندرہ منٹ کی تقریر لکھنے کو کہا تھا، تم نے بیٹھتے بیٹھتے منٹ کی کیوں لکھی تو اس بیچارے نے عرض کی کہ جناب میں نے آپ کو پندرہ منٹ کی تقریر کی تین کا بیٹیاں دی تھیں۔ جو بائیڈن کی ذہنی و جسمانی حالت بھی برٹنیف سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ شاید آج کے امریکی سامراج اور آخری دہائیوں کے سوویت یونین کے درمیان بھی کم از کم جزوی تمثیل یا انالوجی قائم کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ دونوں ریاستیں بالکل مختلف بلکہ متضاد سماجی نظاموں کی نمائندہ تھیں۔

ان حالات میں امریکی ریاست کی پالیسی سازی اور پھر اپنی پالیسیوں کو نافذ کروانے کی صلاحیت کا اندازہ لگانا محال نہیں ہے۔ متضاد بیانات، بے بسی اور تذبذب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو اسرائیل کی بھرپور اور غیر مشروط حمایت کے بیانات سے غیر اعلانیہ یا نیم ذمت تک چلا جاتا ہے (جس میں بھی ہتھیاروں کی سپلائی بند کرنے کی نیم دلانہ دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں)۔ اسرائیل کے سامنے ایک ریڈ لائن کھینچنے ہیں۔ جب وہ اسے عبور کر لیتا ہے تو دوسری کھینچ

سوچ سکتا۔ فراڈ اور رشوت ستانی کے سنگین الزامات کے تحت حکومت سے باہر ہوتے ہی اسے جیل کی ہوا اور عدالتوں کے دھکے کھانے پڑ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ہٹ کے بھی شاید وہ اسرائیل کے دشمنوں کی ہر ممکن حد تک خوریزی اور بربادی کی قیمت پر جنگی فتح کے ذریعے 'فیلڈ مارشل' جیسا رتبہ حاصل کرنے یا تاحیات اقتدار میں رہنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس ساری منصوبہ بندی میں بالآخر غرہ سے تمام فلسطینی آبادی کا اخلا بھی شامل ہے۔ جس کی طرف ابتدائی اقدامات اٹھائے جا چکے ہیں۔ لیکن اکثر جنگوں کے مضمرات اور نتائج موضوعی خواہشات سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔

امریکی سامراج کا زوال

موجودہ صورتحال کی تشکیل میں امریکی سامراج کی تاریخی گراؤت اور سامراجی اسٹیبلشمنٹ میں موجود گہری تقسیم بھی اہم عنصر کے طور پر شامل ہے۔ ایک طرف معاشی یا اقتصادی حوالے سے چین کے مقابلے میں امریکہ کا نسبی زوال ہے۔ چین اس وقت لاطینی امریکہ، افریقہ اور مشرق وسطیٰ (مجموعی طور پر دنیا کے 120 ممالک) کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے اور اپنی بیرونی سرمایہ کاری میں روز افزوں اضافہ کر رہا ہے۔ دنیا میں اس کے مسلسل بڑھتے مالیاتی حجم اور اقتصادی اثر و رسوخ کا ناگزیر مطلب سیاسی و سفارتی وزن میں اضافہ ہے۔ جس نے سنجیدہ سامراجی پالیسی سازوں کے اوسان خطا کیے ہوئے ہیں اور جس کا ازالہ وہ عسکری دھونس کے ذریعے کرنے کی کوشش میں ہیں۔

لیکن عراق اور افغانستان میں امریکہ کی براہ راست ذلالت، شام میں بالواسطہ شکست اور دوسری پیشتر صورتوں میں معاملات کو کنٹرول نہ کر پانے کی خجالت نے امریکی سامراج کی ساکھ، رعب و دبدبے اور اس کے پالیسی سازوں کے اعتماد اور حوصلے کو گہری چوٹ پہنچائی ہے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ وہ فی الوقت اسرائیل کے چکر میں مشرق وسطیٰ میں کسی بڑے جنگی تنازعے کے براہ راست فریق بننے سے کترارے ہیں۔

پھر ٹرمپ کا مسئلہ ہے۔ جو ایک 'آؤٹ سائیڈز' ہونے کے باوجود امریکی آبادی کے بڑے حصے کی حمایت اور مروجہ سیاست و ریاست کے اندر گہرا اثر و رسوخ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے، دہائیوں میں تعمیر کیے گئے عالمی لبرل آرڈر کو تھس نہیں کرنے کے درپے ہے اور سنجیدہ سامراجی پالیسی سازوں کے لئے ایک مسلسل درد سر بنا ہوا ہے۔ اسرائیل کی طرح امریکہ میں بھی یہ صورتحال گہری سماجی بے چینی اور تقسیم کی غماز ہے اور امریکی حکمران طبقے در ریاست کو مسلسل تذبذب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔

اثرات مرتب کرے گی۔ تیل کی قیمتیں آسمان تک پہنچ جائیں گی اور اقتصادی عدم استحکام کا نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بڑھ کر شاید سامراجیوں کو اپنی عام آبادی بالخصوص نوجوانوں کی طرف سے دباؤ، نفرت اور حقارت کا سامنا ہے۔ فلسطینیوں کی نسل کشی اور مسلسل بد معاشی پر مبنی صیہونی ریاست کا طرز عمل پوری دنیا میں سامراجی منافقت کے خلاف شدید غم و غصے کو جنم دے رہا ہے۔ جس کا اظہار احتجاجی مظاہروں اور سوشل میڈیا ایکٹوئزم وغیرہ پر مبنی بین الاقوامی سنجیدگی کی مہم کی شکل میں بھی ہو رہا ہے۔ 'یوگوو' (YouGov) کی جانب سے پانچ یورپی ممالک (اطلی، بیلجیئم، سویڈن، فرانس، جرمنی) میں کی جانے والی ایک رائے شماری کے مطابق ووٹ ڈالنے کی اہل آبادی کا کم از کم نصف حصہ اسرائیل کو ہتھیاروں کی فراہمی بند کرنے کا حامی ہے۔ جن میں اکثریت نوجوانوں کی ہے۔ جبکہ اس سے بھی بڑی تعداد میں لوگ اسرائیل پر پابندیاں لگانے کے حق میں ہیں۔ یہ نتائج پوری دنیا میں عام لوگوں کی رائے عامہ میں ایک بڑی شگفتگی کی غماز کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ حالات و واقعات اسرائیل سے باہر یہودی نوجوانوں کی بڑی تعداد کو بھی صیہونیت سے دور ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ جو اسرائیل کی بین الاقوامی ساکھ کے لئے دھچکے سے کم نہیں ہے۔

خود اسرائیل میں تمام تر جنگی جنون کے باوجود نتیجہ یا ہو کی پوزیشن بہت مستحکم نہیں ہے۔ حسن نصر اللہ کے قتل کے بعد اس کی مقبولیت میں کچھ اضافہ ضرور ہوا ہے۔ لیکن اسرائیل کے 'چینل 12' کی ایک حالیہ رائے شماری کے مطابق اگر آج انتخابات ہوں تو نیتن یاہو کا اتحاد پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل نہیں کر سکے گا۔ آنے والے دنوں میں جنگ کی تباہ کاریاں نیتن یاہو کی مقبولیت میں مزید کمی کا باعث بنیں گی۔ جس کا ازالہ کرنے کے لئے وہ مزید جارحیت اور مہم جوئی پر مجبور ہوگا۔ یوں ان حالات میں نیتن یاہو اور اس کے ٹوٹے کی سیاسی بقا کی واحد ضمانت جنگ کا تسلسل ہے۔ بنیادی طور پر درندہ صفت انسانوں کا یہ گروہ ایسی ڈھلوان پر بھاگ رہا ہے جس کی مزاحمت کی صورت میں منہ کے بل لڑھک جائے گا۔ لیکن اس دوڑ کا حتمی انجام بھی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ویسے اگر غور کریں تو تاریخی طور پر فسطائی یا نیم فسطائی رجحانات (جن میں آج کل کے بیشتر پاپولسٹ اور فارارائٹ کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے) کے بیشتر رہنما اسی اسیے کا شکار نظر آتے ہیں۔

نیتن یاہو کی کرسی خود اس سے بھی بڑے پاگلوں اور جنونیوں کے سہارے پر رکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اتحادیوں کے خلاف جاکے کوئی معقول طرز عمل اپنانے کا نہیں

کے رہ گئے ہیں۔ اور یہ راستہ کسی امن و استحکام کی منزل کی جانب ہرگز نہیں جاتا۔ کسی انتہائی صورتحال میں یقین یا ہو کو جسمانی یا سیاسی طور پر راستے سے ہٹائے جانے کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کام نہ تو آسان ہوگا نہ خطرات سے خالی۔

ایران کا المیہ

گزشتہ ایک سال کے دوران اسرائیل کی پوری کوشش رہی ہے کہ حماس کے خلاف آپریشن کو خطے میں ایرانی پراکسیوں (حوثی، حزب اللہ و دیگر) کے خلاف کاروائیوں تک توسیع دے کر ایران کے پرکترے جائیں اور ہر ممکن حد تک ایران کو ایک کھلی جنگ میں گھسیٹنے کی کوشش کی جائے۔ جس میں ایران کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جائے۔ جبکہ ایران کی اسی قدر کوشش رہی ہے کہ اسرائیل کے ساتھ براہ



راست جنگ میں جانے سے گریز کرے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

اسرائیل اور امریکہ کی طرح ایرانی ریاست خود ایک گہرے داخلی بحران سے دوچار ہے۔ ریاستی طاقت کیساتھ انتہائی ایرانی ملائیت کی وسیع بدعنوانی اور لوٹ مار، مذہبی جبر پر مبنی پالیسیوں، عوام کی معاشی بدحالی اور گھٹن کے حالات کے خلاف نئی نسل کی بے چینی جیسے عوامل نے تھیوکرٹک ریاست کو اندر سے کھولا کر کے رکھ دیا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دہائی کے دوران ایران میں کم از کم دس بڑی احتجاجی تحریکیں ابھر چکی ہیں جن کے مطالبات جمہوری و شہری آزادیوں، صنفی امتیاز و جبر کے خاتمے، طبقاتی مسائل کے حل اور معاشی حالات میں بہتری سے لے کے موجودہ ریاست کے یکسر خاتمے تک

استعمال تک جاسکتا ہے (یاد رہے کہ اسرائیل کی پالیسی ہے کہ کسی وجودی خطرے کی صورت میں وہ جوہری ہتھیاروں کے استعمال سے نہیں کترائے گا)۔ علاوہ ازیں وہ بطور فلسطینی آبادی غزہ (یا مشرقی کنارے) کا خاتمہ یا اسرائیل میں ادغام بھی نہیں چاہیں گے۔ کم از کم ایسے یکجہت اور تباہ کن انداز سے نہیں جیسے کہ یقین یا ہو جیسوں کی خواہش ہے۔ کیونکہ ایسا کوئی بھی اقدام نہ صرف دور یا سستی حل کی دہائیوں سے تحقیق کردہ منافقت کو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے کوڑے دان میں ڈال دے گا بلکہ عرب آبادیوں میں پہلے سے موجود شدید غم و غصے کو نقطہ اشتعال تک پہنچانے کے خطے میں بغاوتوں، سیاسی عدم استحکام اور ریاستوں کے دھڑن تختوں کے نئے سلسلے کا آغاز کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے چین، یورپی طاقتیں اور بیشتر عرب ریاستیں امریکیوں کی ہم خیال نظر آتی ہیں۔ اسی لئے ہر

دیتے ہیں۔ لکیریں کھینچنے اور مٹانے کا یہ سلسلہ پچھلے ایک سال سے جاری ہے۔ جس کے پیچھے محض منافقت کا عنصر ہی کارفرما نہیں ہے۔ جو بائینڈن کی ذہنی حالت کے پیش نظر اس کی عملداری یا اتھارٹی ناپید نہیں تو انتہائی محدود ضرور ہے۔ یوں بطور امریکی صدر اس کی اہمیت زیادہ تر علامتی ہی ہے۔

اسی دوران صدارتی انتخابات کی مہم کا شور و غوغا جاری ہے۔ بائینڈن نے ایک سنگین وارننگ میں واضح کیا ہے کہ اس بار ضروری نہیں کہ امریکی انتخابات پر امن ہی ہوں۔ ٹرمپ اگر ہارتا ہے تو آسانی سے اپنی شکست تسلیم نہیں کرے گا۔ لیکن اگر جیت جاتا ہے تو یہ بھی کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر صورت میں یہ ایک پکٹا ہوا بحران ہے۔ نتیجتاً ریاستی و عسکری افسر شاہی کا کردار لامحالہ طور پر بڑھ جاتا ہے جس میں بائینڈن سے بھی بڑے جنگی قاتلوں اور جنونیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

موجودہ حالات کا بھرپور فائدہ ٹرمپ بھی اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس نے اسرائیل پر ایران کے تازہ میزائل حملے کے بعد دلچسپ تبصرہ کیا:

”دنیا کے حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ایران نے اسرائیل پر 200 بیلٹک میزائل پھینکے ہیں اور ہم ایک عالمی تباہی کے اتنے قریب پہنچ گئے جتنے پہلے کبھی نہیں تھے۔ ہمارا ایک صدر ہے جو ویسے ہی غائب ہے اور ایک نائب صدر ہے جسے معاملات کو سنبھالنا چاہئے۔ لیکن وہ سافرنسکو میں (اپنی انتخابی مہم کے لئے) فنڈ اکٹھے کرتی اور تصویریں کھینچتی پھر رہی ہے۔ کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے اور یہ بھی نہیں پتا کہ کون زیادہ کنفیوژ ہے: بائینڈن یا کمالا۔ دونوں کو نہیں معلوم کہ ہو کیا رہا ہے۔“

سیاسی پوائنٹ سکورنگ اور مبالغہ آرائی سے قطع نظر ٹرمپ کا یہ تبصرہ کچھ ایسا نامعقول بھی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود صدر ہوتا تو اسے بھی پتا نہ ہوتا کہ ”ہو کیا رہا ہے“ اور کرنا کیا ہے۔ بلکہ ایسے لوگ اپنے ڈھٹائی اور حماقت پر مبنی ”کانفیڈنس“ میں زیادہ تباہ کن حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ہرفن مولا پاکستان کی اڈیالہ جیل میں بھی سڑ رہا ہے۔

بہر حال مشرق وسطیٰ کی موجودہ صورتحال میں امریکی پالیسی کے بنیادی نکات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ واضح ہے کہ امریکہ اسرائیل کی حمایت، پشت پناہی و امداد سے کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ لیکن موجودہ حالات میں امریکی اسرائیل کو خطے میں کوئی بڑی جنگ بھی کھولنے دینا نہیں چاہتے۔ بالخصوص ایک ایسا تصادم جس میں ایران براہ راست ملوث ہو۔ کیونکہ اس صورت میں وسیع پیمانے کی ہجرتوں، معاشی بحران اور تباہی کا ایسا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے جو بعض صورتوں میں بالکل بے قابو ہو کے جوہری ہتھیاروں کے

اشتعال انگیزی کے بعد ہر طرف سے ”ہر ممکن حد تک صبر و تحمل“ کی اپیلیں جاری ہوتی ہیں۔ اگرچہ سعودی حکمرانوں کی دلی خواہشات کا معاملہ مختلف ہو سکتا ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یقین یا ہو امریکیوں کی وضع کردہ حدود میں رہنے کو تیار نہیں ہے اور امریکی چار و ناچار اس کی ہر ضد کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ یوں اسرائیل کی حمایت اور یقین یا ہو کی سرزنش کے درمیان توازن قائم کرنا امریکیوں کے لئے ناممکن ثابت ہو رہا ہے۔ اگر غور کریں تو پچھلے ایک سال کے دوران حالات و واقعات کی سمت کے تعین میں امریکہ کا کردار کسی متحرک پلیئر سے زیادہ نیم مجہول تماشا کی کارہا ہے۔ یقین یا ہو کو اپنی پیروی پر مجبور کرنے کی بجائے عملاً وہ اس کی کھینچی ہوئی لکیروں کے فقیر بن

ہے۔ ایران، اسرائیل اور امریکہ کے درمیان یہ جزوی یا وقتی مفاہمت ماضی میں کئی مواقع پر نظر آئی ہے۔ لیکن حالات پھر انہیں ایسی نچ بچھی لے جاسکتے ہیں جہاں تصادم اور خونریزی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔

مسئلہ یہ ہے کہ 7 اکتوبر کے واقعات کے بعد مذکورہ وجوہات کی بنا پر اسرائیل نے ایران کو زچ کرنے اور اشتعال دلانے کی ہر حد کو عبور کیا ہے۔ ان حالات میں اپنے عوام، افواج اور علاقائی پراکسیوں کے سامنے 'فیس سیونگ' کے لئے جوانی کا روائی ایرانی ریاست کی مجبوری بن چکی تھی۔ اس سلسلے میں اسرائیل پر 13 اپریل اور پھر یکم اکتوبر کے میزائل حملے بنیادی طور پر علامتی اہمیت کے حامل تھے جن کا مقصد اسرائیل کو وارننگ دینا تھا۔ دونوں مرتبہ حملوں کے بعد ایران نے واضح کیا کہ وہ مزید تصادم نہیں چاہتا۔ تاہم 13 اپریل کی خاصی 'دوستانہ' کاروائی (جس کی اطلاع بھی پیٹنگی دی گئی تھی اور نسبتاً بے ضرر ہتھیاروں کا استعمال کیا گیا تھا) کی نسبت یکم اکتوبر کا حملہ ایک زیادہ سخت اور پیچیدہ وارننگ کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کیفیت میں پھر ناکریر طور پر ایران کی اپنی عسکری صلاحیتوں کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ معاشی و عسکری حوالے سے ایران اسرائیل سے خاصا کمزور ملک ہے۔ لیکن اس باوجود یہ علاقائی پیمانے کی ایک بڑی سامراجی طاقت ہے جس کے پاس بنیادی صنعتی انفراسٹرکچر، خود انحصاری پر مبنی دفاعی تحقیق اور پیداوار کا نظام (جس میں یہ جدید ڈرون اور میزائل بھی تیار کر رہا ہے اور حالیہ عرصے میں روس کو بیچ بھی رہا ہے)، تیل کے وسیع ذخائر، بالائی درمیانے درجے کی آمدن والی معیشت اور مقداری حوالے سے خاصی بڑی جبکہ معیاری حوالے سے درمیانے درجے کی فوج موجود ہے۔ مثلاً آسانی کے لئے معاشی حوالے سے ہی موازنہ کریں تو ایران کافی کس جی ڈی پی پاکستان سے تین گنا ہے!

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایران نے اسرائیل کے وجود کے حق کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ایرانی ملاں ریاست نے اپنے وجود کا جواز ہی ہمیشہ امریکہ و اسرائیل دشمنی کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جنہیں وہ شیطانی قوتیں قرار دیتا ہے اور مسلمان دنیا میں خود کو ان کے خلاف مزاحمت کے علمبردار کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس حوالے سے اسرائیل کیساتھ براہ راست جنگ میں نہ جانے کی تمام تر کوشش کے باوجود ایران نے طویل عرصے سے ایسی ممکنہ صورتحال کی تیاری کم از کم جاری رکھی ہے۔ فضائی جنگ اور ایئر ڈیفنس وغیرہ میں اسرائیل کی غیر متنازعہ برتری کے باوجود ایران نے ایسے جنگی شعبوں میں ترقی جاری رکھی ہے جن کے ذریعے وہ اپنی مذکورہ بالا

بھی 18 میٹر نیچے تھا جسے نشانہ بنانے کے لئے تقریباً ایک ہزار کلوگرام وزنی امریکی ہیکر مشین بھوں کا استعمال کیا گیا اور عمارتوں کے پورے بلاک کو طے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ اسرائیل کی اس حکمت عملی کو ڈاہیا ڈاکٹر ان کا نام دیا جاتا ہے جو بنیادی طور پر دشمن تنظیموں یا حکومتوں پر دباؤ بڑھانے کے لئے پورے پورے رہائشی علاقوں کو ملیامیت کر دینے پر مبنی ہے اور جس کا بے دریغ استعمال گزشتہ دودھائیوں سے جاری ہے۔ غزہ پر حالیہ وحشت کے دوران اس نام نہاد ڈاکٹر ان کو نئی انتہاؤں پر لے جایا گیا ہے۔

بہر حال نصر اللہ کا قتل بھی حزب اللہ میں موجود اسرائیلی

جاتے ہیں اور جنہیں انتہائی بے دردی سے پکلا گیا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ جنگ لامحالہ طور پر ایران کی پہلے سے نحیف اور پابندیوں سے دوچار معیشت کا مزید ہیرہ غرق کر دے گی۔ ایرانی ریاست کو اپنے اور اپنی پراکسیوں کے جنگی اخراجات میں کئی گنا اضافہ کرنا پڑے گا۔ جان و مال کا یہ بے نظیر ضیاع ایران کے داخلی بحران کو زیادہ شدت سے بھڑکانے کا موجب بن کے نئی عوامی بغاوتوں کو مشتعل کر سکتا ہے۔

تاریخی طور پر ایران کی پالیسی اپنی پراکسیوں کے ذریعے اسرائیل کے ساتھ ایک بالواسطہ، مبہم اور کم شدت پر مبنی طویل جنگ لڑنے کی رہی ہے جس میں دشمن کو تھکا کے



جاسوسوں سے حاصل کردہ معلومات کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ گزشتہ چند ہفتوں میں ہونے والے یہ واقعات دشمنی ممالک یا تنظیموں میں موساد کی گہری سرایت اور بے رحمی کی ہر حد تک جانے کی خاصیت کو واضح کرتے ہیں۔ اس سے قبل بھی اسرائیل کی جانب سے ایران کے اندر اور باہر ایرانی ایٹمی سائنسدانوں اور اہم عسکری شخصیات کو قتل کرنے کی طویل تاریخ موجود ہے۔ اس عسکری تناظر میں اسرائیل کے ساتھ جنگ ایران کے لئے بڑی بربادی کا موجب بن سکتی ہے جس میں سب سے پہلے امریکہ کے عطا کردہ جدید ترین جنگی جہازوں کے ذریعے ایرانی جوہری تنصیبات اور تیل کے انفراسٹرکچر وغیرہ کو تباہ کیا جائے گا۔ اسرائیل کے مقابلے میں ایران کی ایئر فورس عملاً ناپید ہے۔ ایسی افواہیں بھی ہیں کہ ایران روس سے جدید 'سوخوئی 35' جہاز خریدنا چاہتا ہے۔ لیکن نہ صرف سیاسی و سفارتی بلکہ عسکری حوالے سے بھی یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران نے اسرائیل سے براہ راست ٹکر لینے سے اجتناب برتنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ متحارب ترین سامراجی طاقتوں کے درمیان بھی کسی نہ کسی سطح پر انڈر سٹینڈنگ اور مفاہمت موجود ہوتی ہے جس کے تحت تمام تر مخالفت اور عداوت کے باوجود مخصوص حالات میں مشترکہ مفادات کا تعاقب کیا جاتا

مجبور رکھا جائے یا بے بس کیا جائے۔ کیونکہ ایرانیوں کو اسرائیل کی بے انتہا معاشی، تکنیکی اور عسکری برتری کا پورا احساس ہے۔ جس کا مظاہرہ اسرائیلیوں نے حزب اللہ کے پیروں میں دھماکوں سے لے کر اسماعیل ہانیہ اور حسن نصر اللہ کے قتل تک کیا ہے۔ مثلاً اسماعیل ہانیہ کو کس طرح قتل کیا گیا اس بارے میں ابھی تک وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک ممکنہ صورت یہ ہے کہ تہران میں ان کی رہائش گاہ پر ایران کے اندر سے ہی میزائل داغا گیا۔ جبکہ ایک اور امکان یہ بھی ہے تہران میں جس جگہ انہوں نے رہائش اختیار کر رکھی تھی وہاں کئی ہفتے یا مہینے پہلے ہی بم نصب کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈرون سے نشانہ بنائے جانے کی چہل گویاں بھی ہیں۔ بہر صورت گھر آئے مہمان کا اس طرح سے قتل ایران کے لئے بڑی خجالت اور شرم کا باعث بنا ہے۔ جو ایرانی انٹیلی جنس کی بڑی ناکامی کے ساتھ ساتھ خود ایرانی ریاست میں موجود موساد کے وسیع و عریض نیٹ ورک کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ حسن نصر اللہ کی ہلاکت کا ہے۔ جنہیں عین اس وقت ایک زیر زمین ہیکر میں نشانہ بنایا گیا جب وہ حزب اللہ کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ ملاقات کر رہے تھے۔ تاکہ قیادت کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا جاسکے۔ کثیر منزلہ غارت میں موجود نصر اللہ کا ہیکر سطح زمین سے

والی ایک رائے شاری کے مطابق فلسطینیوں میں مسلح جدوجہد کی حمایت 8 فیصد اضافے کے ساتھ 54 فیصد جبکہ حماس کی حمایت 6 فیصد اضافے کے ساتھ 40 فیصد تک جا پہنچی ہے۔ دو تہائی لوگوں کا خیال تھا 7 اکتوبر کے حملے کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ جبکہ صرف 20 فیصد فلسطینی محمود عباس کو سپورٹ کرتے ہیں۔ تقریباً اسی عرصے میں کی جانے والی کچھ دوسرے رائے شماریوں کے مطابق حماس کی حمایت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اسی طرح خود امریکی میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق حماس کی سرگلوں کا زیادہ تر تہیت درک (65 سے 80 فیصد تک) بدستور قائم ہے جبکہ اس کے ایک تہائی جنگجوؤں کا ہی خاتمہ کیا جاسکا ہے۔ حماس کے اپنے ذرائع کے مطابق اس کے صرف 20 فیصد جنگجو ہلاک ہوئے ہیں۔ جبکہ جنگ کے دوران بھی حماس بڑے پیمانے پر ریکورمنٹ کر رہی ہے۔ یکم اکتوبر کو جس وقت ایرانی میزائل اسرائیل پر منڈلا رہے تھے، تل ابیب میں حماس کی ایک کاروائی بھی جاری تھی۔ جس میں تنظیم کے دو مسلح جنگجوؤں نے گولیوں اور چاقو چھریوں کے ذریعے سات اسرائیلی شہریوں کو ہلاک اور 17 کو زخمی کیا۔ اسی طرح غزہ کے اندر بھی اسرائیلی سپاہیوں اور ٹینکوں وغیرہ پر حملوں کی اطلاعات اور پراپیگنڈہ ویڈیوز منظر عام پر آتی رہی ہیں۔

اسی قسم کی صورت حال حزب اللہ کی بھی ہے۔ جسے پیچر دھاکوں اور اعلیٰ قیادت کے بیشتر لوگوں کے قتل کے ذریعے ایک شدید وقتی چھکنا ضرور پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اس کی اسرائیل کے خلاف لڑنے کی صلاحیت بدستور قائم ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ حزب اللہ حماس نہیں ہے۔ جس کا اظہار جنوبی لبنان میں داخل ہونے والی اسرائیلی افواج کے خلاف شدید مزاحمت کی صورت میں بھی ہوا ہے۔ کچھ گھنٹے پہلے تک کی اطلاعات کے مطابق لبنان میں آٹھ اسرائیلی فوجی اب تک ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ حزب اللہ کی جانب سے جنوبی لبنان اور اسرائیل کے اندر مزید حملوں کے دعوے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر لبنان کے اندر زمینی لڑائی کا پہلا دن تھا!

تاریخ واضح کرتی ہے کہ محض عسکری طریقوں سے حماس یا حزب اللہ جیسی تنظیموں کو چکنا کم و بیش ناممکن ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب انہیں مقامی آبادیوں کی جزوی حمایت بھی حاصل ہو۔ مزید برآں یہ محض تنظیمیں نہیں ہیں بلکہ اپنی رجعتی یا مذہبی آؤٹ لک کے باوجود اسرائیل کی قبضہ گیری اور مغربی سامراج کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے ساتھ جڑے رجحانات ہیں۔ جن کے تنظیمی ڈھانچوں کو توڑ بھی دیا جاتا ہے تو یہ نئی شکل میں سامنے آ جائیں گے یا ان کی جگہ زیادہ جارحانہ تنظیمیں لے لیں گی۔

موجودہ واقعات کو 2006ء کی لبنان اسرائیل جنگ

قسم کے دیسی ساختہ میزائلوں سے لے کے S-300 جیسے جدید روسی میزائل سسٹم بھی شامل ہیں۔ جن کی موجودگی میں اسرائیلی جہازوں کے لئے ایرانی آسمانوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ایسے امکانات بھی ہیں کہ آنے والے دنوں میں روس کی ہچکچاہٹ کے باوجود ایران اس سے زمین سے فضا میں مار کرنے والے S-400 میزائل سسٹم حاصل کر لے۔ جو S-300 سے کہیں زیادہ جدید ہیں۔

لیکن ایران کا سب سے اہم جنگی اثاثہ پھر پورے خطے میں پھیلے اس کے پراکسی گروہ ہیں جن کے پاس وسیع افرادی قوت موجود ہے۔ صرف حزب اللہ کے جنگجوؤں کی تعداد کا اندازہ 40 ہزار تک جاتا ہے۔ مزید برآں یہ گزشتہ طویل عرصے سے یمن، عراق، شام، لبنان وغیرہ میں انتہائی خونریز اور پیچیدہ جنگوں میں لڑنے کا تجربہ اور تربیت رکھتے ہیں اور ان کے خصوصی پوتش خاصے جدید اسلحے سے لیس بھی ہیں۔ اس حوالے سے کوئی بڑی جنگ، جو آخر کار زمین پر ہی لڑی جائے گی، اسرائیل کے لئے بھی خاصی پریشان کن بلکہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

ان چند ایک حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایران پر براہ راست چڑھائی اسرائیلیوں کے لئے ساگرہ کا ایک کانٹے جیسی نہیں ہوگی۔ اسرائیلی اگر یہ حساب لگا کے بیٹھے ہیں کہ بیرونی حملے کی صورت میں بحران زدہ ایرانی ریاست کے اندر تیزی سے ٹوٹ پھوٹ جنم لے گی تو ان کی اپنی داخلی حالت بھی کوئی زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ نہ ہی اسرائیلی فوج کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ بہر حال جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ کوئی خوش کن تاظر بھی یقیناً نہیں ہے اور ایسے خوفناک نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جن کی اندازہ لگانا بھی ابھی محال ہے۔ ایسے حالات ایران کو اپنا ایٹمی پروگرام تیز کرنے اور محض ایٹم بم بنانے کی دھمکیاں دینے سے آگے بڑھنے پر بھی مجبور کر سکتے ہیں۔ کچھ اندازوں کے مطابق ایران چاہے تو ایک سال کے اندر اندر جوہری ہتھیار تیار کر سکتا ہے۔

موجودہ صورتحال اور آگے کے امکانات

پہلے غزہ اور اب لبنان میں حالیہ اسرائیلی جارحیت کو اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو اسے ایک بلند ترین پائے پر 'مکعبہ' کا تسلسل قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ گزشتہ ایک سال کے دوران اتنی بربادی اور خونریزی کے باوجود آج کا اسرائیل 17 اکتوبر 2023ء کی نسبت کہیں زیادہ غیر محفوظ اور غیر مستحکم ہے۔ نہ حماس کو کچلا جاسکا ہے نہ غزہ میں موجود اسرائیلی ریغالیوں کی رہائی ممکن ہو سکی ہے۔ الٹا کئی حوالوں سے فلسطینیوں میں حماس کی حمایت میں اضافہ ہوا ہے۔ کچھ مہینے قبل رائٹرز کی جانب سے رپورٹ کی جانے

کمزوریوں کا ازالہ کر سکے۔ اس حوالے سے اسرائیل پر حالیہ فضائی حملہ خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ جس میں ایران نے پہلی بار اپنے 'ہائپر ساک' میزائلوں (''فتح'') کا استعمال کر کے ایک واضح پیغام دیا ہے۔ یہ میزائل مہینہ طور پر آوازی رفتار سے پانچ سے پندرہ گنا تیزی سے اپنے اہداف کو ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دور تک نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انہیں ہوا میں تباہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی محال ضرور ہے۔ مزید برآں حملے کے لئے دانستہ طور پر رات کا وقت منتخب کیا گیا تاکہ پوری دنیا کو یہ میزائل اسرائیل کے زیر قبضہ علاقوں (یروشلم، تل ابیب وغیرہ) کو نشانہ بناتے ہوئے نظر آئیں۔ ایران کا دعویٰ ہے کہ اس نے اسرائیل کے فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنایا اور 90 فیصد میزائل اسرائیل کے مشہور زمانہ آئرن ڈوم اور دوسرے ایئر ڈیفنس کے نظاموں کو چہرتے ہوئے اپنے اہداف کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ اگرچہ پراپیگنڈہ کے مقاصد کے تحت کی جانے والی مبالغہ آرائی ہے لیکن پھر 99 فیصد میزائلوں کو راستے میں ہی تباہ کرنے کے امریکی اسرائیلی دعوے اس سے بھی بڑی مبالغہ آرائی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ حملے کی ویڈیو فٹجز میں سینکڑوں نہیں تو درجنوں میزائلوں کو اسرائیلی علاقوں پر گرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ بعد ازاں خود اسرائیلی میڈیا میں ایسی رپورٹیں سامنے آئی ہیں کہ 'نیو اتم' ایئر بیس سمیت اسرائیلی فضا کے ٹھکانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ جبکہ ایک میزائل تل ابیب میں موساد کے ہیڈ کوارٹر کے بالکل قریب بھی گرا ہے۔

اگرچہ پہلے کی طرح اس بار بھی ایران کی کوشش تھی کہ اپنا پیغام کم سے کم نقصان کے ساتھ پہنچایا جائے تاکہ کسی بڑی جوابی کاروائی سے بچا جاسکے۔ اس مقصد کے لئے عین ممکن ہے کہ ایرانی میزائلوں میں ایسے وار ہیڈز کا استعمال کیا گیا ہو جو بڑی تباہی کا موجب نہیں بنتے۔ لیکن یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ اپنے عسکری نقصانات کی خبروں کو سختی سے دبانے اسرائیل کی پرانی پالیسی ہے اور اس حوالے سے سنسر شپ کا باقاعدہ نظام موجود ہے۔ بہر صورت اسرائیل کے امریکی و دیسی ایئر ڈیفنس سسٹم اتنے ناقابل تغیر نہیں ہیں جتنے سمجھے جاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ایران خود یا اس کی پراکسیاں اسرائیل کے اندر تباہی پھیلانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

فضائی جنگ کے میدان میں اگرچہ ایرانی ایئر فورس کا اپنے اسرائیلی مد مقابل سے کوئی مقابلہ نہیں بنتا۔ موخر الذکر ایف 16 سے لے کر ایف 35 جیسے جدید ترین امریکی جہازوں سے لیس ہے۔ لیکن اس میدان میں بھی ایران کے پاس ایک توڑ یہ ہے کہ اس کے پاس زمین سے فضا میں مار کرنے والے نسبتاً جدید ہتھیار موجود ہیں۔ جس میں درجنوں

کے اجتماع کی ہوس ہی ہے جو مشرق وسطیٰ سمیت دنیا کے بیشتر حصوں کو تاراج کرتی جاتی ہے۔ پچھلے ایک سال میں وہ کن ساجر اور کوئی بربریت ہے جسے غزہ میں روانہ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس نسل کشی کے متشابہاتوں اور سہولت کاروں میں سیکولرازم، جمہوریت اور انسانی حقوق کے مغربی علمبرداروں سے لے کر ترکی، سعودی عرب اور پاکستان میں مذہب اور 'امت' کی سیاست کرنے والوں تک سب شامل ہیں۔

17 اکتوبر کے حملے نے صورتحال کو یکسر بدل دیا ورنہ "ابراہیم اکارڈز" کے تحت یہ عرب حکمران اسرائیل کے ساتھ دوستی اور محبت کی بیٹنگیں بڑھانے میں ہر حد تک جانے کو تیار تھے۔ جس میں شاید پاکستان میں ان کھ پتلیاں بھی پیچھے نہ رہتیں۔

یہ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے اس لبرل آرڈر کا مکروہ چہرہ ہے جسے سوویت یونین کے انہدام کے بعد انسانیت کو ترقی، استحکام اور خوشحالی کے بام عروج تک پہنچانا تھا۔ دنیا آج ماضی کے کسی دور سے کہیں زیادہ عدم استحکام، انتشار اور خونریزی سے دوچار ہے۔ یہ استحصال، جبر اور انسان دشمنی پر مبنی ایک تاریخی طور پر متروک سماجی نظام کے ناگزیر مضمرات ہیں۔ جو ہرگز رتے دن کے ساتھ نسل انسان کو بربریت کی طرف دھکیلتا جاتا ہے۔

اسرائیل کا وجود مشرق وسطیٰ کے جسم پر کسی کینسر سے کم نہیں ہے۔ اسے قائم ہی خطے پر سامراجی دھوس اور بدعاشی کو مسلسل مسلط رکھنے کے لئے کیا گیا تھا۔ آج تمام عرب حکمران اور ان کی ریاستیں اس سامراجی پراجیکٹ کی حصہ دار اور سہولت کار ہیں۔ اس دنیا کے مظلوم اور محکوم عوام کے سوا فلسطینیوں کا کوئی ہمدرد، کوئی دوست نہیں ہے۔ ایرانی ملاں ریاست بذات خود ایک انتہائی جاہل اور رجعتی اکائی ہے جس کا کردار اپنے ملک کے اندر اور باہر محنت کش عوام کی تحریکوں کو کچلنے پر مبنی رہا ہے اور جو آخری تجزیے میں اسی سامراجی نظام کے دوام کا ہی اوزار ہے۔ یہی کردار چین اور روس کی ریاستوں کا بھی ہے۔ لیکن حالیہ بحران اور انتشار بالفرض ختم جاتا ہے تو بھی جب تک اسرائیل کی صیہونی ریاست کا وجود باقی ہے مشرق وسطیٰ میں کوئی دور رس امن و استحکام قائم نہیں ہو سکتا۔ اسرائیلی ریاست کو یکسر تحلیل کرنے کے پروگرام کے بغیر مشرق وسطیٰ کی سوشلسٹ فیڈریشن کا نعرہ بھی ایک فریب اور حماقت بن کے رہ جاتا ہے۔ لیکن پھر صیہونی ریاست کو اکھاڑ پھینکنے کا فریضہ پورے مشرق وسطیٰ میں سرمایہ دارانہ ریاستوں کے دھڑن تختے اور سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کیساتھ مشروط ہے۔ جو خطے کے محنت کش عوام کی طبقاتی بغاوتوں کو مسلسل سوشلسٹ انقلاب کے پروگرام اور لائحہ عمل کیساتھ مربوط کرنے سے ہی ممکن ہے۔

ظاہر ہے الگ سے ایک تفصیلی تجزیے کا متقاضی ہے۔ ایران نے مزاحمت کے عندیے کے طور پر اپنے وزیر خارجہ کو بھی لبنان بھیجا ہے۔ اسی طرح 4 اکتوبر کو پانچ سال میں پہلی بار آیت اللہ خامنہ ای نے رائل اپنے ساتھ رکھ کر جمعے کے خطبے میں دسیوں ہزار لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے اسرائیل کو ایک خبیث ریاست قرار دیا جو امریکی مدد کے بغیر "زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی" انہوں نے مزید واضح کیا کہ خطے میں (ایرانی) مزاحمت پیچھے نہیں ہٹے گی اور ابھی اسرائیل کو بہت کم سزا دی گئی ہے۔

لیکن کوئی غیر معمولی صورتحال پھر روس کو بھی مشرق وسطیٰ میں اپنی سافٹ پاور سفارت کاری کی جگہ زیادہ واضح اور یکطرفہ پوزیشن لینے پر مجبور کر سکتی ہے۔ روس کے اس وقت حماس، فتح اور اسلامک جہاد جیسے فلسطینی گروہوں کیساتھ بھی مراسم ہیں جبکہ اسرائیل کے ساتھ بھی اس کے تعلقات اس حد تک استوار ہیں کہ شام میں وہ روسی ٹھکانوں یا املاک کو نشانہ بنانے سے اجتناب برتا ہے۔ اسرائیل نے بھی یوکرین کے معاملے میں نہایت لائق فی غیر جانبداری کا رویہ اپنایا ہے۔ اس سے ہٹ کے بھی روس اور اسرائیل کے درمیان کئی معاشی و سیوری معاملات میں معاونت موجود ہے۔ دوسری طرف ایران کیساتھ بھی اس کے گہرے سفارتی و عسکری مراسم موجود ہیں۔ عراق، شام، افغانستان اور وسط ایشیا کے ممالک میں دونوں ایک دوسرے کے پارٹنر ہیں اور جدید ملٹری ہارڈ ویئر کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں روس تیل اور گیس وغیرہ کی صورت میں یورپ کو توانائی کا بڑا فروخت کنندہ ہے اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے ساتھ بھی توانائی اور دوسرے شعبوں میں تجارت و سرمایہ کاری کرتا ہے۔ ایران اور اسرائیل کے درمیان براہ راست جنگ روس کے لئے کڑا امتحان ثابت ہوگی۔ لیکن شاید اس سے بھی مشکل صورتحال چین کی ہے جس کا روس سے بھی بڑا کاروبار ہر کسی کے ساتھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوتیں ابھی تک کھل کے کسی جانبداری کا مظاہرہ کرنے سے اجتناب برت رہی ہیں اور ایک توازن قائم رکھنے کی کٹھن جدوجہد میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ توازن خاصا نازک ہے جسے غیر معمولی واقعات بگاڑ بھی سکتے ہیں۔

حالات ہر لمحہ بدل رہے ہیں اور واقعات بہت تیزی سے جنم لے رہے ہیں۔ یہ صورتحال اس بنیادی مارکسی تجزیس کو ایک بار پھر درست ثابت کرتی ہے کہ آج سامراجی سرمایہ داری کے پاس انسانیت کو دینے کے لئے محرومی، ذلت اور جنگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس نظام میں سرمائے کے مفادات ہی مقدم ہیں اور پیسے کے رشتے ہی تعلق اور ناطے پر حاوی ہیں۔ یہ آخری تجزیے میں منافع خوری اور سرمائے

کے پس منظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جس میں اسرائیل کو خاصی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس شکست سے اسرائیلی افواج نے بہت سے اسباق حاصل کیے تھے لیکن پھر ایسی ہی تیاری حزب اللہ بھی سالہا سال سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ جس کے جنگجو اپنے علاقوں کے چپے چپے سے واقف اور مشکل زمینی حالات میں لڑنے کے ماہر ہیں۔ یوں ڈاہیا ڈاکٹر ان کے تحت فضا سے اندھا دھند بارود برسانا خاصا آسان کام ہے۔ لیکن زمینی جنگ ایک بالکل مختلف معاملہ بن کے رہ جاتی ہے۔

یہ سوال بھی اہم ہے کہ ایران کے حالیہ حملے کا جواب اسرائیل کس طرح دے سکتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ مساوات ہے جس میں بین الاقوامی دباؤ اور سفارت و مصالحت کی کوششوں کا بھی اہم کردار ہوگا۔ اسرائیل ایران کے اندر بھی کاروائی کرنے کی طرف جاسکتا ہے (جس کے امکانات کا جائزہ اوپر لیا گیا ہے) اور ایران سے باہر ایرانی اثاثوں یا پراکسیوں کے خلاف کسی غیر متوقع کاروائی کی صورت میں بھی جواب دے سکتا ہے۔ لیکن ہر دو صورتوں میں جوابی کاروائی کی نوعیت اور شدت ایران کے رد عمل اور آگے کے واقعات کا تعین کرے گی۔

اپریل میں ایران کے علامتی حملے کے جواب میں اسرائیل نے فیس سیونگ کے لئے اصفہان (ایران) پر ایک وارجی سامیڑاں حملہ کیا تھا۔ جب کہ شام اور عراق میں بھی ایرانی اتحادیوں کے ٹھکانوں کو ہلکے پھلکے انداز سے نشانہ بنایا تھا۔ جس کے بعد معاملہ کم از کم وقتی طور پر ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ تاہم اب کی بار صورتحال مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسرائیل کوئی اعلانیہ یا معمول سے مختلف کاروائی کرنے کی بجائے یمن، لبنان اور شام وغیرہ میں ایرانی پراکسیوں پر حملوں میں اس قدر شدت اور وسعت لے آئے کہ ایران کو لامحالہ پھر کوئی رد عمل دینا پڑے۔

ان سطور کی تحریر کے وقت قطر میں ایران اور خلیجی ریاستوں کے اعلیٰ حکام کے اجلاس کی خبریں بھی گردش میں ہیں۔ جس میں یقیناً صورتحال کو مزید بگڑنے سے روکنے کی راہ نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔ قطر کے ذریعے ایران کے امریکہ کے ساتھ مذاکرات کی اطلاعات بھی ہیں جن میں ایرانیوں نے واضح کیا ہے کہ "یکطرفہ صبر و تحمل کا مرحلہ گزر چکا ہے"۔ لیکن شاید اس سے بھی اہم خبر یہ ہے خلیجی ریاستوں نے ایران کو اپنی غیر جانبداری کا یقین دلایا ہے۔ کیونکہ کسی بڑے تصادم کی صورت میں انہیں اپنی تیل کی تصصیلات برباد ہو جانے کا خوف بھی لاحق ہے۔ گزشتہ کچھ دہائیوں میں نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ عالمی سطح کے پیچیدہ تنازعات میں بھی قطر کا 'مصالحانہ' اور ثالثی پر مبنی کردار اور اثر و رسوخ ایک دلچسپ منظر ہے۔ جو

سری لنکا ڈسٹانائیکے کی آزمائش!



21 ستمبر کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں بائیں بازو کے نیشنل پیپلز پاور اتحاد کے مشترکہ امیدوار ڈسٹانائیکے نے سب سے زیادہ ووٹ (42 فیصد) حاصل کر کے ملک کا صدر منتخب ہوئے۔

تحریر: راہول

وہیں موصوف خود کو ایک اصلاح پسند اور لیبرل ڈیموکریٹ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کا پروگرام اقتصادی بہتری کو اپنی ترجیح بنانا، حکومت کی بدعنوانی کو ختم کرنا، شفافیت کو فروغ دینا اور آئی ایم ایف سے دوبارہ مذاکرات کرنا وغیرہ ہے۔ موجودہ حالات میں یہ بالکل غیر حقیقی اور غیر عملی باتیں بن کر رہ جاتی ہیں۔

اگر ماضی میں دیکھا جائے تو بے دی پی خود کو ایک 'مارکسسٹ لیننٹ' پارٹی کہتی تھی۔ اگرچہ اس وقت بھی اس کی پالیسیوں پر سنہالی قوم پرستی اور طبقاتی مصالحت کی چھاپ واضح تھی۔ لیکن ریاست کے خلاف مسلح بغاوتیں کرنے پر اس کے کارکنوں کو بڑے پیمانے پر قتل کرنے سمیت قید اور جلاوطن بھی کیا گیا۔ مگر آج اس جماعت کا عملی پروگرام نہ صرف سوشل ڈیموکریسی کی حدود میں مقید ہے بلکہ اس نے اپنے انقلابی ماضی سے کافی حد تک کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

ڈسٹانائیکے نے اپنی انتخابی مہم میں بدعنوانی کے خاتمے اور آئی ایم ایف کے ساتھ موجودہ معاہدے کو دوبارہ مذاکرات کے ذریعے بہتر کرنے کے وعدے تو کیے ہیں۔ لیکن ایسی مہم معاشی پالیسیاں اس کے اقتدار کے لیے شدید مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔ اکاؤنٹس کے مطابق ”ڈسٹانائیکے

ڈسٹانائیکے کے لیے ان انتخابات کا نتیجہ اقتصادی دباؤ اور بدلتے ہوئے عالمی حالات میں ایک سنگین چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

2022ء میں سری لنکا کو اپنی تاریخ کے بدترین اقتصادی بحران کا سامنا تھا جس کے نتیجے میں عوام نے سڑکوں پر نکل کر سابق صدر گوتابایا راچاپا کے کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ اگرچہ اس وقت کی پارلیمنٹ، جو کہ راچاپا کے کے حامیوں پر مشتمل تھی، نے رائیل وکرما سنگھ کو صدر منتخب کیا جس نے آئی ایم ایف کی ایما پر بیل آؤٹ پیکیج کے عوض عوام پر بدترین معاشی حملے جاری رکھے۔ ایسے میں یہ ناگزیر تھا کہ حالیہ انتخابات میں عوام ان تمام پرانی جماعتوں اور سیاسی خاندانوں کو مکمل طور پر مسترد کر دیں جو دہائیوں سے ملک کو تباہی کی طرف دھکیل رہے تھے۔

ڈسٹانائیکے کی کامیابی کی بنیادی وجہ مروجہ سیاست کی کرپشن، بدنامی اور عوام کو درپیش معاشی مسائل ہیں۔ وہ خود بھی معاشی دیوالیے کے موجودہ حالات، جن میں بھوک، غربت اور بیروزگاری میں ہوشربا اضافہ ہوا ہے، کی سنگینی سے اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن جہاں تمام عالمی میڈیا اسے ”مارکسی“ یا ریڈیکل بائیں بازو کے نظریات کی طرف جھکاؤ رکھنے والے سیاست دان کے طور پر متعارف کروا رہا ہے

سنگین سیاسی و اقتصادی بحران میں دو سال گزارنے کے بعد سری لنکا کے عوام نے صدارتی انتخابات میں ”بائیں بازو“ کی طرف جھکاؤ رکھنے والے سیاست دان اور جناتھا وکٹی پیرامونا (جے وی پی) کے رہنما انورا کمار ڈسٹانائیکے (اے کے ڈی) کو ملک کا صدر منتخب کیا ہے۔ 21 ستمبر کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں بائیں بازو کے نیشنل پیپلز پاور اتحاد کے مشترکہ امیدوار ڈسٹانائیکے نے سب سے زیادہ ووٹ (42 فیصد) حاصل کر کے اپوزیشن رہنما سبجیت پریماداسا کو شکست دی جبکہ سابق صدر رائیل وکرما سنگھ مجموعی طور پر تیسرے نمبر پر رہے۔

ڈسٹانائیکے کی اس فتح کو سری لنکا کے سیاسی منظر نامے میں ایک بڑی تبدیلی کی علامت سمجھا جا سکتا ہے۔ یقیناً یہ نتیجہ ایک ایسی شخصیت کے حوالے سے نہایت حیران کن ہے جس نے 2019ء کے انتخابات میں محض تین فیصد ووٹ لیے ہوں اور صرف پانچ سال بعد ملک کا صدر منتخب ہو جائے۔ مگر ڈسٹانائیکے کی یہ کامیابی جہاں سری لنکا کے عوام کی جانب سے روایتی سیاسی جماعتوں کے واضح استرداد کی نشاندہی کرتی ہے وہیں خود

کا اقتدار ایک نازک کیفیت میں کھڑا ہے۔ جہاں اس کے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک مشکل وقت ہے اور سری لنکا کو مستقبل کے لیے کسی معجزے کی ضرورت ہے۔“

جے وی پی کا ماضی کافی تلخیوں سے دوچار رہا ہے۔ یہ جماعت ماضی میں اقلیتی گروہوں خصوصاً تاملوں اور مسلمانوں کے حوالے سے متنازعہ رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ حالیہ انتخابات میں بھی ان علاقوں میں جے وی پی کی حمایت کمزور رہی جہاں تامل اور مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اس جماعت کو ماضی میں سنہالی قوم پرست جماعت سمجھا جاتا تھا اور اقلیتیں اب بھی جے وی پی پر مکمل اعتماد کرتے دکھائی نہیں دیتیں۔ ان آبادیوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ہی اس نے اپنے انتخابی منشور میں مختلف نسلی اور مذہبی گروہوں کے درمیان اتحاد کا وعدہ کیا ہے۔

آنے والے عرصے میں صدر ڈسانائیکے کو نہ صرف سنگین معاشی چیلنجوں کا سامنا رہے گا بلکہ ایک مکمل سیاسی بحران بھی اس کا منتظر ہے۔ موجودہ پارلیمنٹ، جسے 24 ستمبر کو تحلیل کر دیا گیا تھا، میں ڈسانائیکے کی جماعت کو اکثریت حاصل نہیں تھی۔ ایسے میں جے وی پی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ نومبر میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں بھی کامیابی حاصل کرے۔ اگر جے وی پی ان انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے تو انہیں حکومت بنانے اور قانون سازی وغیرہ کے لیے سیاسی اتحاد تلاش کرنے ہوں گے اور اس کے لیے شاید دوبارہ انہی پرانی جماعتوں کے ساتھ اتحاد اور مفاہمت کرنی پڑے جن کے خلاف وہ اپنی پوری انتخابی مہم چلاتے رہے ہیں۔ ایسے میں سری لنکا کے عوام، جو معاشی مشکلات سے پہلے ہی بدحال ہیں، جلد نئے صدر سے بھی مایوس ہونے کی طرف جائیں گے۔

ڈسانائیکے کی کامیابی نہ صرف سری لنکا کی داخلی سیاست بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔ سری لنکا کے جغرافیائی محل وقوع اور تہذیبیاتی (Strategic) اہمیت نے بھارت اور چین دونوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانی ہے (جبکہ پاکستان کی مداخلت بھی موجود رہی ہے)۔ بحر ہند میں واقع ہونے کی وجہ سے سری لنکا عالمی تجارتی راستوں کے بیچ شمار کیا جاتا ہے۔ جس کے باعث یہ خطہ بھارت اور چین کے لیے نہ صرف اقتصادی بلکہ جغرافیائی لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ بھارت کی سری لنکا میں دلچسپی کئی پہلوؤں پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے تو سری لنکا بھارت کے جنوبی ساحل کے قریب واقع ہے اور دونوں ممالک کے درمیان تاریخی ثقافتی اور مذہبی تعلقات بھی رہے ہیں۔ اگرچہ تاملوں کی مسلح بغاوت کو لے کے دونوں ممالک کے سرکاری تعلقات میں تضادات اور تلخیاں بھی آئیں۔

حالیہ عرصے میں بھارت سری لنکا میں چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے محتاط نظر آتا ہے اور وہاں اپنا اقتصادی اور سیاسی اثر برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا بھارت نے سری لنکا کے مختلف ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کی ہے۔ خاص طور پر شمالی سری لنکا میں جہاں تامل نسل کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ تامل اقلیت کے حقوق کا مسئلہ بھارت کے لیے اہم رہا ہے کیونکہ بھارت میں تامل ناڈو کی ریاست کے لوگ سری لنکا کے تاملوں کے ساتھ نسلی اور ثقافتی جڑت رکھتے ہیں۔ بھارت نے سری لنکا کو 2022ء میں بڑے پیمانے پر اقتصادی امداد بھی فراہم کی تھی اور وہاں کے اہم بندرگاہی منصوبوں میں بھی بھارتی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے تاکہ چین کے بڑھتے ہوئے اثر کا مقابلہ کیا جاسکے۔ جے وی پی کو تاریخی طور پر بھارت مخالف سمجھا جاتا رہا ہے۔ تاہم اپنے مفادات کو مد نظر رکھتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی نے ڈسانائیکے کو انتخابی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو مزید مضبوط کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ بھارت اور سری لنکا کے درمیان نزدیکیاں چین کے لیے ناخوشگوار یا مشکلات کا باعث بن سکتی ہیں۔

چین کی سری لنکا میں دلچسپی ”بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے“ کا اہم پہلو ہے۔ جس کے تحت چین بحر ہند میں اپنے تجارتی راستوں کو محفوظ بنانا چاہتا ہے۔ چین نے سری لنکا میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے۔ اس سلسلے میں ہمبھوتا بندرگاہ کی تعمیر اور کلبو میں اربن ترقیاتی منصوبے اہم ہیں۔ ہمبھوتا بندرگاہ کو چین کے لیے اہم تہذیبیاتی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے جو کہ بحر ہند میں چین کی موجودگی کو تقویت دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ چین سری لنکا کو بنیادی انفراسٹرکچر کی ترقی کے لیے قرضے بھی فراہم کرتا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے سری لنکا پرچینی قرضوں کا بوجھ بڑھا ہے۔ جس پر پھر بھارت اور مغربی ممالک کی جانب سے خدشات ظاہر کیے گئے کہ سری لنکا چینی قرضوں کے جال میں پھنسا جاتا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ مزید چین کے سیاسی اور اقتصادی دائرہ اثر میں آسکتا ہے (اگرچہ سری لنکا پر مغرب سمیت دوسرے ممالک کے قرضوں کا بوجھ چین سے کہیں زیادہ ہے)۔ اس تناظر میں سری لنکا بھارت اور چین دونوں کے لیے ایک اہم میدان جنگ بن چکا ہے جہاں دونوں ممالک اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ صدر ڈسانائیکے کے لیے یہ بھی اہم چیلنج ہوگا کہ وہ بھارت اور چین جیسی سامراجی قوتوں کے درمیان کیسے توازن برقرار رکھتا ہے۔ خاص طور پر ان منصوبوں کے حوالے سے جو دونوں ممالک کے معاشی و تہذیبیاتی مفادات سے جڑے ہوئے ہیں۔ عالمی سرمایہ داری آج گہرے بحران کا شکار ہے۔ دنیا کا کوئی بھی خطہ وہاں نظام کی متروکیت ہرگز رتے دن کے

ساتھ اپنا اظہار کر رہی ہے۔ بحران کی سنگینی جیسے جیسے بڑھ رہی ہے محنت کش عوام پر معاشی حملوں کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جبکہ ان حملوں کے خلاف خود روتھریوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ بھی جاری ہے۔ سری لنکا کے حالیہ انتخابات میں عوام نے پرانے نظام کو مسترد کرنے کا واضح پیغام دیا ہے۔ کسی متبادل انقلابی قیادت کی عدم موجودگی میں عارضی طور پر ہی سہی لیکن عوام نے جے وی پی پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اب صدر ڈسانائیکے کا کڑا امتحان عوام کی توقعات پر پورا اترنا ہے۔ عوام کو یہ توقع ہے کہ معیشت کو بحال کیا جائے گا، ان کے حالات زندگی میں بہتری آئے گی اور بدعنوانی کو ختم کیا جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ڈسانائیکے کو آئی ایم ایف اور دیگر عالمی قرض دہندگان کے ساتھ کیے گئے قرضوں کی ادائیگی کے معاہدوں پر بھی عمل درآمد کرنا ہوگا۔ آئی ایم ایف کیساتھ معاہدے پر نظر ثانی کی باتیں قابل عمل نہیں ہیں۔ بہترین صورتوں میں بھی بہت معمولی رعایتیں ہی مل سکیں گے۔ چنانچہ آئی ایم ایف کے پروگرام میں ہوتے ہوئے محنت کش عوام کی بہتری کے لیے اقدامات اٹھانے کی گنجائش کم و بیش ناپید ہی ہوگی۔ چاہے کرپشن کو کنٹرول بھی کر لیا جائے۔ اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ بحران زدہ سرمایہ داری میں رہتے ہوئے بدعنوانی کے خاتمے کی باتیں بھی سراب ہی ہیں۔

یوں پوری عالمی سرمایہ داری کے بحران کے حالات میں خاطر خواہ معاشی بحالی کے لیے سطحی قسم کی اصلاحات ناکافی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ڈسانائیکے نے اپنی وکٹری سپیج میں سری لنکا کو آئی ایم ایف کے ساتھ ”شرکت داری“ میں آگے بڑھانے کی بات کی ہے۔ جو کمپرڈ مائیز کا واضح اشارہ ہے۔ مارکسی نظریات سے انحراف کرنے والی اس قیادت کا طبقاتی جدوجہد، بیرونی قرضوں کی مضبوطی، نیشنلائزیشن اور نجی ملکیت کے خاتمے جیسے انقلابی اقدامات سے کوئی لینا دینا نہیں۔ لیکن پھر ایسے اقدامات کے بغیر بہتری کی کوئی صورت بھی نہیں ہے۔ ماضی کے حکمرانوں کی طرح ڈسانائیکے کا اقتدار بھی عالمی قرضوں، مالیاتی اداروں اور سامراجی سرمایہ کاری کا مرہون منت ہی رہے گا۔ ان سامراجی اداروں اور قوتوں کے ایجنڈے میں عوامی فلاح جیسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ ان کے لیے مقدم صرف منافعوں کا حصول ہے۔ یہ حالات 2022ء میں انقلابی سرکشی کی نچ تک چلے جانے والے محنت کش عوام بالخصوص نوجوانوں کے سامنے نئے چیلنج اور نئے سوالات رکھیں گے۔ نہ صرف سری لنکا بلکہ دنیا بھر کے استحصال زدہ لوگوں کے سامنے اصلاح پسندی کی محدودیت اور متروکیت ایک بار پھر واضح ہوگی اور ناگزیر طور پر آگے کی جدوجہدوں کی سیاسی و نظریاتی سمت کے تعین میں اہم کردار ادا کرے گی۔

انقلاب روس 1917ء اور آج کی دنیا



1917ء کا انقلاب روس انسانیت کی عظیم تاریخی جست تھی جس نے تاریخ کا دھارا ہمیشہ کے لئے موڑ دیا۔ اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ پورے کرہ ارض پر حکمران طبقات کے تخت لرز نے لگے۔

تحریر: لال خان

ڈاکٹر لال خان کا یہ آرٹیکل 7 نومبر 2017ء کو شائع کیا گیا تھا۔ اس سال انقلاب روس کی 107 ویں سالگرہ کے موقع پر قارئین کے لئے اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

موڑ دیا۔ اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ پورے کرہ ارض پر حکمران طبقات کے تخت لرز نے لگے۔

امریکہ کا انقلابی صحافی جان ریڈ، جس نے انقلاب کے واقعات کا براہ راست مشاہدہ کیا، اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'دنیا کو ہلا دینے والے دس دن' میں لکھتا ہے، "کوئی بالشویزم کے بارے میں کچھ بھی سوچے، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انقلاب روس انسانیت کی تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک ہے اور بالشویکوں کا اقتدار عالمگیر اہمیت کا حامل ہے۔"

اس وقت زار شاہی روس میں نافذ پرانے کیلنڈر کے مطابق انقلابی سرکشی کا آغاز 25 اکتوبر (نئے کیلنڈر کے مطابق 7 نومبر) کی شام کو ہوا اور بالشویکوں کا اقتدار پر قبضہ کرنے میں اس وقت کی قیادت کی اور سماج کی اکثریت کی حاکمیت کی بنیادیں استوار کیں۔ 1917ء کا انقلاب روس انسانیت کی عظیم تاریخی جست تھی جس نے تاریخ کا دھارا ہمیشہ کے لئے

لینن نے اس حقیقی تبدیلی کی وضاحت کی جو انقلاب کو پیدا کرنا تھی۔ اس نے دسمبر 1917ء میں لکھا، "آج کے اہم ترین فرائض میں یہ شامل ہے کہ محنت کشوں کی آزادانہ پیش قدمی کو پروان چڑھایا جائے۔ اسے ہر ممکن حد تک وسیع کر کے تخلیقی تنظیمی کام میں تبدیل کیا جائے۔ ہمیں ہر قیمت پر اس پرانے، فضول، وحشی اور قابل نفرت عقیدے کو پاش پاش کرنا ہوگا کہ صرف نام نہاد اعلیٰ طبقات، امرا اور امریکی تعلیم و تربیت پانے والے ہی ریاست کا نظام چلا سکتے ہیں اور

سوسال پہلے روس میں بالشویک انقلاب برپا ہوا۔ انسانی سماج کے طبقات میں تقسیم ہونے کے بعد سے یہ محنت کشوں کی سب سے فیصلہ کن فتح تھی۔ اس سرکشی کے ذریعے بالشویکوں نے ایک اقلیتی طبقے کے اقتدار کے خلاف اکثریت کی قیادت کی اور سماج کی اکثریت کی حاکمیت کی بنیادیں استوار کیں۔ 1917ء کا انقلاب روس انسانیت کی عظیم تاریخی جست تھی جس نے تاریخ کا دھارا ہمیشہ کے لئے

بالشویک انقلاب 1917ء

حاصل تھی۔ یوں یہ ایک مخلوط حکومت تھی۔ انقلاب کے بعد صرف فسطائی 'بلک ہنڈرڈ' پر پابندی عائد کی گئی۔ حتیٰ کہ بورژوا لبرل پارٹی (کیڈٹوں) کو بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت تھی۔ نئے انقلابی اقتدار کی بنیاد تاریخ کا سب سے جمہوری نظام، یعنی مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں

نوملود مزدور ریاست نے ضبط کر لیا۔ مالیاتی سرمائے کی آمریت کو توڑا گیا، تمام بیرونی تجارت پر ریاست نے اپنی اجارہ داری قائم کی۔ وزیروں اور عہدیداروں کی مراعات کا خاتمہ کیا گیا اور انقلاب کے رہنما بھی انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وکٹر سرج اپنی 'ایک انقلابی کی یادداشتوں'



کی سوویتیں تھیں۔ ان سوویتوں کو معیشت، زراعت، صنعت، فوج اور سماج کا انتظام جمہوری طریقے سے چلانے کے لئے نیچے سے اوپر تک منظم کیا گیا تھا۔ لینن نے سوویت نظام کے رہنما اصول غیر مبہم طور پر وضع کئے تھے:

* سوویت ریاست کے تمام عہدوں کے لئے جمہوری انتخابات

* تمام حکام کو کسی بھی وقت واپس بلانے کا اختیار

* کسی بھی اہلکار کی اجرات کا ہنرمند مزدور سے زیادہ نہ ہونا

میں لکھتا ہے: "کریملن میں لینن نوکروں کے لئے تعمیر کئے گئے چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ موسم سرما کے دوران باقی سب کی طرح اس کے پاس بھی گھر کو گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جب وہ نائی کے پاس جاتا تو اپنی باری کا انتظار کرتا اور کسی دوسرے کے پیچھے ہٹنے کو نامناسب خیال کرتا۔"

بالشویکوں کا جمہوری طرز عمل مسلمہ تھا۔ ابتدا میں نئی انقلابی حکومت کو بالشویکوں کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کے سوشل انقلابیوں اور منشویک انٹرنیشنلسٹوں کی حمایت بھی

سوشلسٹ سماج کو منظم کر سکتے ہیں۔"

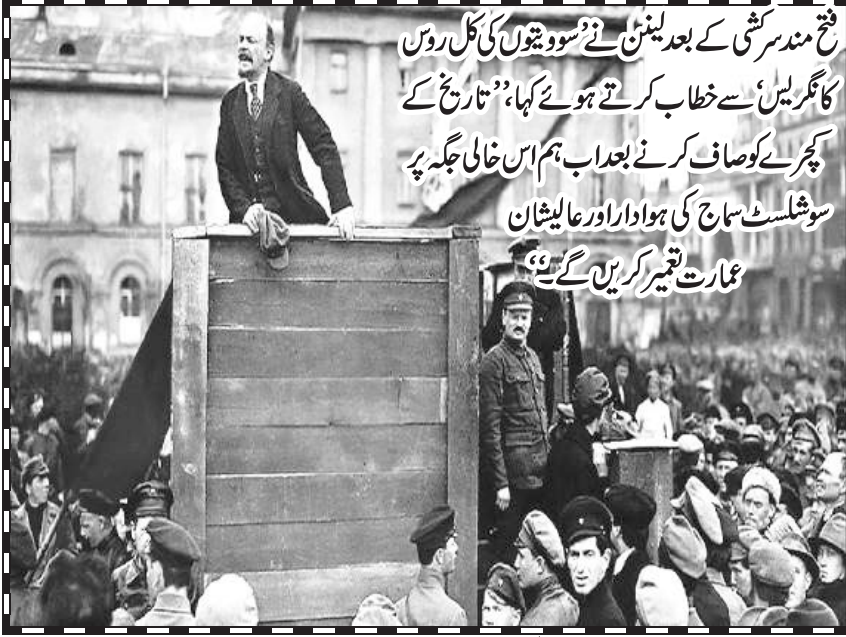
بالشویک پارٹی کی سب سے ممتاز خاصیت یہ تھی کہ انہوں نے محنت کش عوام کے مفادات کی حفاظت کے موضوعی مقصد کو انقلاب کی حرکیات سے جوڑا۔ پارٹی کی حکمت عملی کی بنیاد ان قوانین کی سائنسی دریافت تھی جن کے تحت عوامی تحریکیں اور سماجی شورشیں اتار چڑھاؤ سے گزر کر آگے بڑھتی ہیں۔ جدوجہد میں محکوم اور استحصال زدہ عوام صرف اپنے مطالبات، امنگوں اور ضروریات سے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگیوں کے تجربات سے بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ عوام کے تجربے کی طرف بالشویکوں کا رویہ کبھی بھی تفحیک آمیز یا گھمنڈی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ اس تجربے کو اپنا نقطہ آغاز بنا کر آگے بڑھتے تھے۔ اصلاح پسند اور جعلی انقلابی مصائب اور رکاوٹوں کا رونا روتے تھے، جبکہ بالشویک مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ ٹرائسکی اپنی تاریخ ساز تصنیف 'انقلاب روس کی تاریخ' میں لکھتا ہے: "بالشویک صرف قول میں نہیں بلکہ فعل میں بھی، صرف ظاہریت میں نہیں بلکہ حقیقت میں بھی انقلابی تھے... بالشویزم نے ایک ایسا مستند انقلابی فرد تخلیق کیا جو اپنے ذاتی وجود، خیالات اور اخلاقی فیصلوں کو ایسے تاریخی مقاصد کے تابع کرتا ہے جو مروجہ سماج سے ناقابل مصالحت ہوتے ہیں۔ پارٹی میں بورژوا نظریات سے ضروری فاصلہ ایک چوکس عدم مصالحت کے ذریعے برقرار رکھا گیا تھا، جس کا روح رواں لینن تھا۔ لینن ایک نشتر کی طرح ان تمام ہندھوں کو مسلسل کاٹتا رہتا تھا جو پیٹی بورژوا ماحول میں پارٹی اور سرکاری رائے عامہ کے درمیان استوار ہوتے تھے۔ عین اسی وقت لینن نے پارٹی کو ابھرتے ہوئے طبقے کے خیالات اور جذبات کی بنیاد پر اپنی رائے عامہ استوار کرنا بھی سکھایا۔ یوں انتخاب، تربیت اور مسلسل جدوجہد کے عمل سے بالشویک پارٹی نے نہ صرف اپنا سیاسی بلکہ اخلاقی ماحول بھی تخلیق کیا، جو بورژوا رائے عامہ سے آزاد اور بالکل برخلاف تھا۔ صرف اسی چیز نے بالشویکوں کو اپنی صفوں میں تذبذب پر قابو پانے اور عمل میں وہ عزم دکھانے کے قابل بنایا جس کے بغیر اکتوبر کی فتح ناممکن تھی۔" فتح مند سرکشی کے بعد لینن نے 'سوویتوں کی کل روس کا نگرہیں' سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "تاریخ کے پچھرے کو صاف کرنے بعد اب ہم اس خالی جگہ پر سوشلسٹ سماج کی ہوادار اور عالیشان عمارت تعمیر کریں گے۔"

انقلاب نے سماجی و معاشی تبدیلی کے ایک نئے عہد کا آغاز کیا۔ وسیع و عریض جاگیروں، بھاری صنعت، کارپوریٹ اجارہ داریوں اور معیشت کے کلیدی شعبوں کو

بالشویک انقلاب 1917ء

1923ء)، چین (1924-25ء) اور برطانیہ (1926ء) میں انقلابات کی شکست سے بالشویک انقلاب کو شدید دھچکا لگا۔ ان شکستوں نے انقلاب روس کی تنہائی اور قومی زوال پذیری کو شدید تر کر دیا۔

1917ء کا انقلاب روس کوئی الگ تھلک قومی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے دور رس بین الاقوامی اثرات مرتب ہوئے۔ اس نے روس میں نہ صرف سرمایہ داری اور جاگیر داری کو اکھاڑا بلکہ سامراج کی بیڑیاں بھی توڑ ڈالیں۔ یہ



فتح مندر سرکشی کے بعد لینن نے 'سوسیالیوں کی کل روس کا نگر لیں' سے خطاب کرتے ہوئے کہا، 'تاریخ کے کچرے کو صاف کرنے بعد اب ہم اس خالی جگہ پر سوشلسٹ سماج کی ہوادار اور عالیشان عمارت تعمیر کریں گے'۔

سرخ فوج کی دلیرانہ مزاحمت اور حملہ آور ریاستوں کے مزدوروں اور سپاہیوں کی حمایت نے سامراجی جارحیت کو شکست دی۔ ٹرائسکی نے زار کی بچی بچی چند لاکھ کی تباہ حال فوج کو پچاس لاکھ کی مضبوط اور منظم سرخ فوج میں تبدیل کر دیا۔ لیکن بالشویک پارٹی کے ہراؤل کارکنان اور باشعور مزدور اس خانہ جنگی میں بڑی تعداد میں مارے گئے۔ اس سے قیادت کا خلا پیدا ہوا جسے پارٹی اور سوویت حکومت میں گھسنے والے موقع پرستوں نے بھرا۔ ضروریات زندگی کی شدید قلت، صنعت و زراعت کے انہدام اور ثقافتی پسماندگی نے انقلاب کی افرشاپانہ زوال پذیری میں اہم کردار ادا کیا۔ لینن 1924ء میں اپنی موت تک اس زوال پذیری کے خلاف جدوجہد کرتا رہا۔ سٹالن نے اس کی وصیت کو کریملن کی آہنی الماریوں میں چھپا دیا۔ اس وصیت میں لینن نے سٹالن کو پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے عہدے سے ہٹانے اور افرشاپانہ کے خلاف جدوجہد کی کال دی تھی۔ یہ دستاویز سٹالن کی موت کے بعد 1956ء میں پارٹی کی بیسویں کانگریس میں کہیں جا کر سامنے آئی۔ یوں تلخ معروضی حالات اور جنگ و انقلاب سے پروتاریہ کے ہراؤل دستے کی تھکاوٹ نے وہ صورتحال پیدا کی جس میں سٹالن کے تحت ریاستی اقتدار کے گرد ایک افرشاپانہ پرت ابھرنے لگی۔

سوویت یونین کی سرحدوں سے بہت دور (بالخصوص یورپ میں) انقلابی ابھاروں کا محرک بنا۔ سامراجی آقا ان عوامی بغاوتوں سے لرز گئے جو سرمایہ داروں کے قلعوں میں ابھرنے لگی تھیں۔ برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے اپنے فرانسیسی ہم منصب کلیمینسو کو 1919ء کے ورسائی کے اجلاس کے دوران ایک خفیہ مراسلے میں لکھا: 'یورپ اور انقلابی جذبات سے لبریز ہے۔ موجودہ حالات کے خلاف محنت کشوں میں نہ صرف عدم اطمینان بلکہ غصے اور بغاوت کا گہرا احساس موجود ہے۔ یورپ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سارے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام پر عوام سوال اٹھا رہے ہیں۔' انقلاب کے مرکز کو کچلنے کے لئے ان سرمایہ دارانہ 'جمہوریتوں' نے نوموڈو سوویت ریاست پر دیوہیکل حملہ کیا۔ ایکس سامراجی ممالک کی افواج روس پر چڑھ دوڑیں۔ خود انقلاب نسبتاً پرامن معاملہ تھا۔ اکتوبر کی سرکشی کے دوران صرف نو لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن یہ سامراجی عسکری جارحیت تھی جس نے پہلے سے عالمی جنگ میں تباہ حال پسماندہ ملک کو خونریزی اور قحط میں غرق کر دیا۔ عوام کی انتہائی محرومی اور بد حالی، جسے خانہ جنگی اور معاشی ناکہ بندی نے شدید تر کر دیا، کی وجہ سے 'ذاتی بقا کی جدوجہد' ختم یا کم نہیں ہوئی بلکہ وحشی کردار اختیار کر گئی۔ جرمی (1918ء) اور پھر

* سماج اور ریاست کو چلانے کے تمام فرائض کی باری باری سب کی طرف سے ادائیگی
یہ انقلاب محکوم اور استعمار زدہ محنت کش طبقات کے لئے کیا معافی رکھتا تھا، اس کی تصویر کشی بڑے پرتاثیر انداز سے جان ریڈ نے کی ہے: 'کسی ہجر زمین پر موتیوں کی طرح سارے افق پر دارالحکومت کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں، جو رات کے وقت دن سے کہیں زیادہ شاندار لگ رہی تھیں۔ بوڑھا خاکروب، جو ایک ہاتھ سے ریڑھی چلا رہا تھا اور دوسرے سے راہ گزر پر جھانڈو دے رہا تھا، دور سے دیکھتے دارالحکومت کو دیکھ کر بے ساختہ چلا اٹھا، 'میرا! سارا پیٹر و گراڈ اب میرا ہے!' انقلاب سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی طور پر محنت کش طبقے کو بے نظیر بلند یوں پر لے گیا تھا!

اگر انقلابی فتح کی وضاحت سائنسی تجزیے سے کی جا سکتی ہے تو مارکسسٹوں پر یہ تاریخی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ بعد ازاں انقلاب کی زوال پذیری اور سوویت یونین کے انہدام کی سائنسی وضاحت کریں۔ درحقیقت انقلاب کے رہنما ولادیمیر لینن نے ایک ملک میں سوشلزم کی تعمیر کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بین الاقوامیت لینن کے لئے کوئی جذباتی لفاظی نہیں تھی۔ وہ انقلاب کو معاشی و تکنیکی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ممالک تک پھیلانے کی ناگزیر ضرورت سے بخوبی واقف تھا۔ یوں مارکسسٹوں نے سوویت یونین کے انہدام کی مشروط پیش گوئی عرصہ قبل کر دی تھی۔ 7 مارچ 1918ء کو صورتحال کا جائزہ لینے ہوئے لینن نے واضح کیا: 'اگر ہم تنہا رہ جاتے ہیں، اگر دوسرے ممالک میں انقلابی فتوحات حاصل نہیں ہوتیں تو حتیٰ فتح کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی... ایک کل یورپی انقلاب ہی ان مصائب سے ہمیں نجات دلا سکتا ہے... اگر جرمین انقلاب برپا نہیں ہوتا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔'

لینن کے ہمراہ انقلاب کی قیادت کرنے والے لیون ٹرائسکی نے 1936ء میں شائع ہونے والی اپنی عمیق تصنیف 'انقلاب سے غداری' میں سٹالن کے تحت انقلاب کی زوال پذیری کا تجزیہ پیش کیا۔ 1980ء کی دہائی میں ہونے والے دیوہیکل واقعات کی پیش گوئی ٹرائسکی نے پانچ دہائیاں قبل کی۔ اس نے واضح کیا تھا کہ اگر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں انقلاب نہیں ہوتا اور سوویت یونین میں ایک سیاسی انقلاب مزدور جمہوریت کو بحال نہیں کرتا تو سرمایہ داری کی بحالی ناگزیر ہے۔ ٹیڈ گرانٹ نے 1943ء میں شائع ہونے والی اپنی تصنیف 'ریاست کا مارکسی نظریہ' میں اس عمل کے تجزیے کو مزید آگے بڑھایا۔ اس کا تناظر منفی طور پر درست ثابت ہوا۔

آج کی تحریکوں اور بغاوتوں کو ایک متبادل نظام اور نظریے کی ضرورت ہے۔ بے شمار سابقہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ آج انقلابی سوشلزم سے منحرف ہو کر تاریخ کے خاتمے پر ایمان لائے ہیں۔ لیکن اس سے بھی بڑا کھلاڑ مارکسزم کو جدید بنانے کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ 1917ء میں انقلاب کی خبر دو ہفتوں بعد برصغیر پہنچی تھی۔ لیکن آج انقلابات ٹیلیوژن اور انٹرنیٹ پر براہ راست دیکھے جاتے ہیں۔ لہذا آج اگر بالشویک انقلاب جیسا کامیاب سوشلسٹ انقلاب برپا ہوتا ہے تو اسے قومی حدود میں مقید کرنا پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ سوویت یونین کے انہدام کے باوجود بالشویک انقلاب آج بھی نسل انسان کی نجات کی جدوجہد کے لئے متشعل راہ ہے۔ گزشتہ پچیس سالوں کے دوران حکمران طبقات اور ان کے پروردہ سیکولر اور مذہبی لیڈروں اور دانشوروں نے مارکسزم کو ناکام ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے۔ انہیں سوشلزم کی موت کا اعلان بار بار کرنا پڑتا ہے، جو بذات خود ایک تم ظریفی ہے۔ تاہم سرمایہ داری کے سنجیدہ پالیسی ساز اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان کے استحصالی نظام کو حقیقی خطرہ آج بھی انقلابی سوشلزم سے ہے۔ ’اکانومسٹ‘ کو انقلاب روس کے صد سالہ جشن کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑا: ”انقلاب کی صد سالہ سالگرہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ اسے مخفی رکھنا ممکن نہیں... مسٹر پیوٹن نے لینن کو نظر انداز اور سٹالن کو بحال کیا ہے۔ اس کی نظر میں ان کے درمیان فرق رومی ریاست اور اس کی شاہی وراثت کی طرف روئے کا تھا... لینن سے اس کا کلیدی اختلاف یہ ہے کہ لینن نے روس کو حق خود ارادیت رکھنے والی جمہوریاؤں کی یونین کے طور پر منظم کیا... معیشت، جمود کا شکار ہے اور مسٹر پیوٹن کا خطبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ بالشویک انقلاب کے بھوت بے چین ہو رہے ہیں۔ لینن اب شاید خود کو مسکرانے کی اجازت دے سکتا ہے!“ ’اکانومسٹ‘ شاید صرف پیوٹن کے سرمایہ دارانہ روس کا حوالہ دے رہا ہے، لیکن یہ کیفیت کم دبیش ہر ملک کے لئے درست ہے۔

لینن اور ٹراٹسکی نے روس سے شروع ہونے والے انقلاب کو پھیلانے اور دنیا بھر کے لوگوں کو یکجا کر کے پورے کرہ ارض کو ’سوویت جمہوریاؤں کی یونین‘ (USSR) بنانے کا عزم کیا تھا۔ آج کے عہد میں کسی ایک ملک میں سوشلسٹ فتح پورے سیارے پر انقلابی طوفان پیدا کر سکتی ہے۔ بالشویک انقلاب کے قائدین کا خواب تبھی پورا ہوگا اور انسان اپنے وجود کے حقیقی مقصد، یعنی کائنات کی تسخیر کی طرف گامزن ہوگا۔

علاج سمیت یہ تمام سہولیات بالکل مفت تھیں۔ رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پانچ کروڑ سے زیادہ فلیٹ تعمیر کئے گئے۔ ریاست روزگاری ضامن تھی اور ہر روزگاری ایک جرم تصور ہوتی تھی۔ یوں منصوبہ بند معیشت نے منڈی کی معیشت پر اپنی فوقیت جدلیات کی زبان میں نہیں بلکہ ٹھوس مادی اور ثقافتی ترقی میں ثابت کی۔

تاہم معیشت جوں جوں پھیلی گئی، زیادہ پیچیدہ، ثقیف اور ترقی یافتہ ہوتی گئی۔ چند ہزار اشیا پیدا کرنے والی معیشت کی منصوبہ بندی چند سو افسران کر سکتے ہیں۔ لیکن دس لاکھ اشیا بنانے والی معیشت کو افسر شاہانہ طریقوں سے نہیں چلایا جاسکتا۔ ٹراٹسکی نے واضح کیا تھا کہ ”ایک منصوبہ بند معیشت کے لئے مزدور جمہوریت اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسانی جسم کے لئے آکسیجن۔“ 1960ء تک سوویت معیشت ایک دیوہیکل حجم حاصل کر چکی تھی اور یہ امریکہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی معیشت تھی جو کپڑوں اور جوتوں سے لے کر ہوائی جہاز اور خلائی راکٹ تک پیدا کرتی تھی۔ افسر شاہی کی بدانتظامی، بدعنوانی، عیاشیوں اور ضیاع کے بوجھ تلے اس معیشت کا دم گھٹ رہا تھا۔ نتیجتاً آخر کار معاشی نمو کی شرح ایک وقت پر صفر ہو گئی۔ دوسری طرف سوویت افسر شاہی کی ہوس اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ اب اپنی مراعات کو اپنے بچوں تک منتقل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ذرائع پیداوار کو اپنی نجی ملکیت میں لے کر ایک بالادست سماجی پرت سے ایک حکمران طبقے میں تبدیل ہونا چاہتے تھے۔ گورباچیف کے دور میں سٹالنٹ افسر شاہانہ ڈھانچے میں رہتے ہوئے معیشت کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن اس سے تضادات شدید تر ہی ہوئے۔ انقلاب کی تنہائی، سوشلزم کی مسخ شدہ ’قومی شکل‘ اور مزدور جمہوریت کی عدم موجودگی میں معاشی بدانتظامی آخر کار سوویت یونین کے انہدام پر منتج ہوئی۔ سوویت یونین میں سوشلزم یا کمیونزم نہیں بلکہ اس کی مسخ شدہ شکل، یعنی سٹالنزم ناکام ہوا۔

آج عالمی سطح پر سرمایہ داری کا بحران انسانیت کی وسیع اکثریت کو غربت، محرومی، جنگوں، دہشت گردی، ماحولیاتی تباہی اور بیماری میں غرق کر رہا ہے۔ یہ تاریخی طور پر متروک نظام ہے اور نسل انسان کی اذیت میں اضافہ ہی کر سکتا ہے۔

آج سرمایہ داری زائد پیداوار، زائد پیداواری صلاحیت اور شرح منافع میں گراوٹ کے اسی نامیاتی بحران کا شکار ہے جس کی نشاندہی مارکس نے کی تھی۔ حتیٰ کہ سنجیدہ اور دور اندیش بورژوا معیشت دان بھی اس بحران کی نامیاتی نوعیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

ٹراٹسکی نے ’لیفٹ اپوزیشن‘ قائم کی اور اس زوال پذیری کے خلاف مردانہ وار مزاحمت کی۔ لیکن اسے انتہائی جبر سے کچل دیا گیا۔ یہ عمل وسیع مراعات رکھنے والے افسر شاہانہ ڈھانچے کے استحکام پر منتج ہوا۔ اجرتوں میں زیادہ سے زیادہ فرق، جو لینن کے دور میں 4:1 ملے کیا گیا تھا، ختم کر دیا گیا۔ اکتوبر انقلاب کے خلاف یہ سیاسی رد انقلاب اتنا جابر تھا کہ 1940ء تک 1917ء میں انقلاب کی قیادت کرنے والی بالشویک مرکزی کمیٹی میں سے صرف ایک انسان باقی بچا تھا۔ یہ سٹالن خود تھا۔ باقی تمام قیادت کو جعلی مقدمات اور شوٹر انلز کے بعد سزائے موت دے دی گئی، قتل یا ’غائب‘ کر دیا گیا یا پھر انہوں نے خودکشی کر لی۔ بہت کم تھے جو طبعی موت مرے۔

تاہم سٹالنٹ زوال پذیری کے باوجود معیشت ریاست کی ملکیت اور منصوبہ بندی میں رہی۔ یہ افسر شاہی کوئی طبقہ نہیں تھی، کیونکہ یہ ذرائع پیداوار کی مالک نہیں تھی، بلکہ یہ ایک طفیلی پرت تھی جو سوویت سخت کش طبقے کی پیدا کردہ قدر زائد کا ایک بڑا حصہ ہڑپ کر جاتی تھی۔ تاہم معیشت پر اس بھاری بوجھ اور افسر شاہانہ بدانتظامی کے باوجود سوویت منصوبہ بند معیشت نے انسانی تاریخ کی تیز ترین ترقی کی۔ چند دہائیوں میں سوویت یونین ایک پسماندہ زرعی ملک سے ترقی یافتہ صنعتی ملک بن گیا۔ سرمایہ داری کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ٹڈ گرانٹ نے اپنی پرمغز کتاب ’روس، انقلاب سے رد انقلاب تک‘ میں لکھا: ”1913ء (قبل از جنگ پیداوار کا عروج) کے بعد کے پچاس سالوں میں دو عالمی جنگوں، بیرونی جارحیت، خانہ جنگی اور دوسری برادریوں کے باوجود کل صنعتی پیداوار میں 52 گنا اضافہ ہوا۔ اس دوران امریکہ میں یہ اضافہ چھ گنا جبکہ برطانیہ میں دو گنا سے بھی کم تھا۔ دوسرے الفاظ میں سوویت یونین ایک پسماندہ زرعی ملک سے دنیا کی دوسری سب سے طاقتور قوم بن گیا، جس کے پاس ایک دیوہیکل صنعتی بنیاد، اعلیٰ ثقافتی معیار اور امریکہ، یورپ اور جاپان میں سائنسدانوں کی کل تعداد سے زیادہ سائنسدان تھے۔ اوسط عمر میں دو گنا سے زیادہ اضافہ ہوا اور بچوں میں شرح اموات میں نو گنا کمی واقع ہوئی۔ اتنی مختصر مدت میں اتنی تیز معاشی پیش رفت کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔“

انقلاب نے جنسی برابری اور زندگی کے ہر شعبے میں خواتین کی شمولیت کو یقینی بنایا۔ حکومت سکولوں میں مفت کھانا، بچوں کے لئے دودھ، حاملہ خواتین اور زچہ بچے کے لئے طبی مراکز، دارلاطفال اور پرورش خانے مہیا کرتی تھی۔ تعلیم و

نواب مائی جبر کی خلاف نفرت کا دوسرا!

جموں کشمیر
انتخابات



بی جے پی نے انتخابات جیتنے کے لیے پانچ سالہ منصوبہ بندی کی تھی۔ تاہم دوٹروں نے یہ تمام منصوبے خاک میں ملا دیے ہیں۔ جموں کشمیر نیشنل کانفرنس اپنے اتحادیوں کے ہمراہ حکومت بنانے کی مضبوط پوزیشن میں ہے اور عمر عبداللہ کو وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا گیا ہے۔

تحریر: حارث قدیر

بھارتی زیر انتظام جموں کشمیر میں 10 سال بعد بالآخر اسمبلی انتخابات تین مرحلوں میں مکمل ہو کر نتائج جاری ہو چکے ہیں۔ 10 سال بعد البتہ یہ انتخابات ماضی کی خصوصی حیثیت والی جموں کشمیر ریاست کی بجائے ایک مرکز کے زیر انتظام علاقے (یونین ٹیریٹری) کی ایک برائے نام اسمبلی کے لیے ہوئے ہیں۔ منتخب ہونے والی حکومت مکمل طور پر مرکز میں حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی طرف سے نامزد کردہ لیفٹیننٹ گورنر کے رحم و کرم پر ہوگی۔

بی جے پی نے انتخابات جیتنے کے لیے پانچ سالہ منصوبہ بندی کی تھی۔ تاہم دوٹروں نے یہ تمام منصوبے خاک میں ملا دیے ہیں۔ جموں کشمیر نیشنل کانفرنس اپنے اتحادیوں کے ہمراہ حکومت بنانے کی مضبوط پوزیشن میں ہے اور عمر عبداللہ کو وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا گیا ہے۔ بی جے پی فریقہ وارانہ تقسیم اور علاقائی تقسیم کو ہوا دے کر اپنے حق میں جوتناج

حاصل کرنا چاہتی تھی اس میں اسے نہ صرف بری طرح ناکامی ہوئی ہے بلکہ پچھلے الیکشن کی نسبت زیادہ نشستیں جیتنے کے باوجود جموں ریجن تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

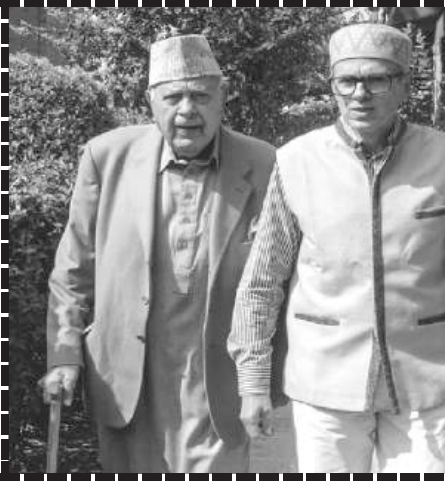
حکمران جماعت بی جے پی نے 2014ء میں اقتدار میں آنے سے قبل جموں کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جسے 2019ء کے انتخابات میں بھی دہرایا گیا تھا۔ مسلسل دوسرے دور اقتدار میں بی جے پی نے اپنے اس وعدے پر پہلی فرصت میں عملدرآمد کیا۔ وزیراعظم نریندر مودی کا مسلسل یہ دعویٰ رہا ہے کہ جموں کشمیر کی ترقی کی راہ میں خصوصی حیثیت رکاوٹ تھی اور ساتھ ہی مسلح بغاوت اور علیحدگی (آزادی) کی آوازوں کی وجہ بھی خصوصی حیثیت کو ہی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ مجموعی طور پر بی جے پی اور اس کی مددگار نیشنل راشنریہ سوانم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے مطابق جموں کشمیر میں موجود تمام مسائل کی جز خصوصی حیثیت ہی تھی۔

2019ء میں خصوصی حیثیت کے خاتمے کے بعد سب سے پہلے غیر ریاستی شہریوں کو جموں کشمیر میں آباد کرنے

کے اقدامات کیے گئے اور 12 ہزار سے زائد ڈومیسائل جاری کیے گئے۔ دوسرا اقدام حلقہ بندیوں کی صورت کیا گیا۔ قانون ساز اسمبلی کی نشستوں میں 7 کا اضافہ کیا گیا۔ یہ اضافہ ہندوؤں کے ایجنڈے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا۔ اکثریتی آبادی پر مشتمل کشمیر وادی، جو مسلم اکثریتی علاقہ بھی ہے، کو ایک اضافی نشست ملی۔ جبکہ آبادی میں اقلیتی اور ہندو اکثریتی علاقے جموں کے لیے 6 نشستوں کا اضافہ کیا گیا۔ ہندو وزیر اعلیٰ تعینات کرنے کا ایجنڈا پیش کر کے حلقہ بندیوں میں بھرپور کوشش کی گئی کہ ہندو اکثریتی حلقوں میں اضافہ کیا جائے۔ یوں جموں میں ہندو اکثریتی حلقوں کی تعداد 24 سے بڑھا کر 31 کر دی گئی اور مسلم اکثریتی حلقوں کی تعداد 12 سے کم کر کے 9 کر دی گئی۔

وادی کشمیر میں ریاست کی 56.15 فیصد آبادی رہتی ہے جبکہ جموں میں 43.85 فیصد آبادی رہتی ہے۔ پچھلی اسمبلی میں وادی کشمیر کی 46 نشستیں تھیں۔ اب 47 ہو گئی ہیں۔ تاہم جموں کی 37 نشستیں بڑھا کر 43 کر دی گئی ہیں۔ بی جے پی

جموں کشمیر انتخابات



عمر عبداللہ اور فاروق عبداللہ کے لیے صرف یہی چیلنج نہیں ہے کہ انہیں چھینے ہوئے آئینی، سیاسی اور مالیاتی اختیارات واپس حاصل کرنے ہیں بلکہ عوام کے معاشی مسائل کو حل کرنے اور تقریباً منجمد معیشت کا پہیہ دوبارہ چلانے کا چیلنج بھی درپیش ہے۔

کے ہندو تو اچھوٹے کے منصوبہ بندی کا انداز اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جموں کشمیر میں 28 فیصد ہندو آبادی کو نئی حلقہ بندیوں کے بعد 34.44 فیصد نشستیں دی گئی ہیں۔

لوک سبھا کے 5 انتخابی حلقوں کی بھی نئی حلقہ بندیوں میں اس تقسیم کو بڑھاوا دینے کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے راجوری اور اننت ناگ کو ملا کر ایک انتخابی حلقہ بھی بنایا گیا تھا۔ تاہم اس میں بھی بی جے پی کو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو پائے تھے۔

جموں کے پہاڑی علاقے پیر پنچال کے 8 انتخابی حلقوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے بی جے پی نے پہاڑی قبائل کو شیڈل ٹرائب میں شامل کر کے ملازمتوں اور تعلیم میں خصوصی کٹے کا حقدار بھی بنایا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس اسمبلی میں 5 مخصوص نشستیں بھی رکھی گئی ہیں جن کا انتخاب منتخب ممبران اسمبلی نہیں کریں گے بلکہ ان کی نامزدگی لیفٹیننٹ گورنر منوج سنہا کریں گے۔ ان نامزد ہونے والے ممبران اسمبلی میں دو خواتین، دو کشمیری پنڈت اور ایک پاکستان سے ہجرت کر کے جانے والے ہندو مہاجرین کی نشست ہوگی۔ ان ممبران کو براہ راست منتخب ہونے والے ممبران کے برابر حقوق حاصل ہوں

سے 7 نشستیں ملی ہیں۔ آزاد امیدواروں کے شامل ہونے کے بعد جموں سے نیشنل کانفرنس کی نشستوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

جنوبی کشمیر کے کل گام حلقے سے یوسف تاریگامی کا مسلسل پانچویں بار الیکشن جیتنا بھی ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ وہ اس اسمبلی میں منتخب ہونے والے واحد کمیونسٹ رہنما ہیں۔

اس باران کا مقابلہ جماعت اسلامی کے حمایت یافتہ آزاد امیدوار سیار احمد رشی سے تھا جنہوں نے اس انتخاب کو اسلام اور کفر کی جنگ بنا کر پیش کر رکھا تھا۔ تاہم اس کے باوجود محنت کشوں کے نمائندہ سرخ پرچم اور درانتی ہتھوڑے کے انتخابی نشان پر یوسف تاریگامی کامیاب ہوئے۔

نیشنل کانفرنس اور اس کے اتحادیوں کو یہ انتخابی فتح آرٹیکل 370 کی صورت خصوصی حیثیت کی بحالی، ریاستی تشخص اور باعزت زندگی کے انتخابی وعدوں پر حاصل ہوئی ہے۔ بالخصوص وادی کشمیر میں ووٹروں نے بی جے پی کے پچھلے پانچ سال کے اقدامات کو مسترد کرتے ہوئے اپنا ووٹ تقسیم کرنے کی بجائے ایک جماعت کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ درحقیقت یہ کتر برائی کے حق میں دیا گیا عوامی فیصلہ ہے جس کا جموں کشمیر میں عام تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ نیشنل کانفرنس اور اس کی اتحادی جماعتوں سے جموں کشمیر کے عوام بالخصوص نوجوانوں کو کوئی بہتری کی امید نہیں ہے۔ تاہم وہ اس وقت بی جے پی کے خوف سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت جموں کشمیر کے لوگوں کے لیے سب سے پہلا

انڈیا (مارکسٹ) (سی پی آئی ایم)، 1 پیپلز کانفرنس، 1 عام آدمی پارٹی، جبکہ 7 آزاد امیدواروں نے جیتی ہیں۔

مجموعی طور پر انتخابات میں بی جے پی نے سب سے زیادہ ووٹ لیا ہے۔ پہلی بار بی جے پی کشمیر ویلی میں بھی ووٹ لینے میں کامیاب ہوئی ہے۔ تاہم نشست کوئی نہیں جیت سکی ہے۔ بی جے پی کی گزشتہ اسمبلی میں اتحادی پی ڈی پی بری طرح شکست سے دوچار ہوئی ہے اور 28 نشستوں سے 3 نشستوں تک محدود ہو گئی ہے۔



نیشنل کانفرنس واحد ایسی پارٹی رہی ہے جس کے کامیاب ہونے والے امیدواروں میں مسلم اور ہندو دونوں شامل ہیں۔ کانگریس اپنے ماضی کے گڑھ جموں کے ہندو اکثریتی حلقوں میں بری طرح شکست سے دوچار ہوئی ہے۔ انتخابی تجزیہ کاروں کے مطابق کانگریس نے جموں میں انتخابی مہم چلانے کی بجائے وادی کشمیر میں مہم چلانے کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے 15 امیدوار کشمیر سے اور 1 جموں سے کامیاب ہوا ہے۔ اس انتخابی پالیسی کو نیشنل کانفرنس نے بارہا تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ نیشنل کانفرنس کو وادی کشمیر سے 5 اور جموں

گے۔ اس طرح مرکزی حکومت کو تمام تر تعصبات کو استعمال کرنے کے بعد بھی اگر کامیابی نہ مل پائی تو 5 نشستوں کا ٹرمپ کارڈ ان کے پاس محفوظ تھا۔

بہر حال رائے دہندگان نے بی جے پی کی تمام حکمت عملی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اب ممبران کی نامزدگی کے اختیار کے باوجود ہندو وزیر اعلیٰ بنانے کا منصوبہ خاک میں مل چکا ہے۔ الیکشن کمیشن کے نتائج کے مطابق 90 نشستوں میں سے 42 نیشنل کانفرنس، 29 بی جے پی، 6 انڈین نیشنل کانگریس، 3 پی ڈی پی، 1 کمیونسٹ پارٹی آف

کشمیر کے لیے 422 ارب 77 کروڑ بھارتی روپے مختص کیے ہیں جو مودی حکومت کے دعوؤں کے برعکس گزشتہ مالی سال کے مقابلے میں 1.2 فیصد کا معمولی اضافہ ہے۔ خطے کا کل بجٹ 1183 ارب 90 کروڑ بھارتی روپے ہے۔

مودی حکومت کا ایک اور دعوئی تھا کہ جموں کشمیر سے عسکریت پسندی کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ تاہم عسکریت پسندی وادی کشمیر میں اگر کسی حد تک ترک کی گئی ہے تو جموں عسکری کاروائیوں کا نیا مرکز بننا جارہا ہے۔ ان عسکری حملوں کو البتہ ماضی کی طرح میڈیا پر زیادہ جگہ نہیں مل رہی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2021ء کے بعد جموں میں عسکریت پسندوں سے جڑے 33 حملے ہوئے ہیں۔ صرف 2024ء میں خطے میں 8 حملے ہوئے جن میں 11 فوجی ہلاک اور 18 زخمی ہوئے۔ وادی کشمیر میں عسکریت کوئی نہیں بلکہ پاکستان نواز نام نہاد حریت قیادتوں کو بھی عوام نے بری طرح مسترد کیا ہے۔ جماعت اسلامی کے رہنماؤں سمیت دیگر کچھ نام نہاد حریت رہنماؤں نے آزاد حیثیت میں انتخابات میں حصہ لیا۔ لیکن ضمانتیں بچانے میں بھی ناکام رہے ہیں۔

جموں کشمیر کے عوام نے البتہ اس حکمران اشرافیہ سے کوئی امید نہیں لگا رکھی ہے۔ نہ ہی ان کا سیاسی شناخت ہی واحد مسئلہ ہے۔ درحقیقت یہ ان تمام مسائل کا ابتدائی اظہار ہے جو مقامی حکمران اشرافیہ کی سہولت کاری کے نتیجے میں قائم سامراجی قبضے کی وجہ سے اس خطے کے محنت کشوں اور نوجوانوں کو درپیش ہیں اور ان سے نجات سامراجی قبضے اور سرمائے کی حاکمیت سے مکمل آزادی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ نیشنل کانفرنس اور اتحادیوں کی فتح درحقیقت کسی واضح متبادل کے فقدان کا شاخسانہ ہے۔ ایک خلا ہے جسے انقلابی نظریات سے لیس واضح متبادل پروگرام کی حامل قوتوں کے ذریعے پر کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب بی جے پی کی پالیسیوں کے نتیجے میں جموں اور وادی کے مابین علاقائی تقسیم اب مذہبی تقسیم کی صورت میں مزید گہری اور پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔

یہ پولرائزیشن آخری تجربے میں محنت کشوں اور نوجوانوں کو تحفظاتی پالیسیوں کے تحت حکمران اشرافیہ کے مفادات کا انحصار بننے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان انتخابات میں 68 فیصد سے زائد ووٹرن آؤٹ بھی سامنے آیا ہے اور نتائج میں ریاست کی پیوست کردہ مذہبی تقسیم اور تعصب کی گہری چھاپ بھی نظر آتی ہے۔ انتخابی نتائج سے البتہ بی جے پی کی پالیسیوں کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار نوجوانوں اور محنت کشوں میں ایک اعتماد کی بحالی ضرور ہوگی۔ جو آنے والے دنوں میں مستقبل کی نئی راہیں تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

کیے گئے عارضی الحاق کے بعد بدترجی اختیارات چھینے جانے کا ایک عمل نظر آتا ہے۔ ہر بار جب مرکز کی طرف سے آئینی اور سیاسی حملہ کیا گیا تو نیشنل کانفرنس نے کبھی معمولی اور کبھی طویل مزاحمت تو کی۔ لیکن آخری تجربے میں مرکز کے ساتھ کچھ دماڑ کی پالیسی ہی اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ دفاع، کرنسی اور مواصلات کے علاوہ تمام آئینی، سیاسی اور مالی اختیارات کی حامل نیم خود مختار ریاست کے حکمران شیخ عبداللہ خاندان کی تیسری نسل کو اسی ریاست کے ایک ٹکڑے کی لیفٹیننٹ گورنر کے تابع مفلوج حکومت کا وزیر اعلیٰ بننا بھی قبول کرنا پڑا ہے۔

عمر عبداللہ اور فاروق عبداللہ کے لیے صرف یہی چیلنج نہیں ہے کہ انہیں چھینے ہوئے آئینی، سیاسی اور مالیاتی اختیارات واپس حاصل کرنے ہیں بلکہ عوام کے معاشی مسائل کو حل کرنے اور تقریباً منجمد معیشت کا پھیلاؤ دوبارہ چلانے کا چیلنج بھی درپیش ہے۔ جس کے لیے ان کے پاس کوئی اختیار موجود نہیں ہے۔ جموں کشمیر میں اس وقت بیروزگاری گزشتہ 45 سال کی بلند ترین شرح پر موجود ہے۔ اس وقت اس خطے میں 28.2 فیصد بیروزگاری کی شرح ہے جو ملک (بھارت) کی بیروزگاری کی شرح 6.1 فیصد سے بہت زیادہ ہے۔ 25 لاکھ نوجوان نوکری کی تلاش میں ہیں۔



لیفٹیننٹ گورنر منوج سنہا

10 لاکھ تعلیم یافتہ نوجوان نوکریوں سے محروم ہیں۔ دوسری جانب 65 فیصد سرکاری آسامیاں خالی ہیں۔ تاہم ان پر تقرریوں کے لیے لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری درکار ہوگی۔ خطے میں 60 ہزار دیہاڑی دار مزدور محض 300 روپے پومیہ کم پائے ہیں۔ مودی حکومت کے بھاری اعلانات محض اعلانات تک ہی محدود رہے ہیں اور انڈسٹریل گروتھ کے دعوے بھی پورے نہیں ہو سکے۔ سال انڈسٹریز، جو اس خطے کی معیشت میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور معیشت رکھتی ہوئی ہے۔

مرکز نے 2024-25ء کے مرکزی بجٹ میں جموں

ہدف بی جے پی سے نجات اور ریاست کی حیثیت کی بحالی ہے تاکہ وہ ماضی میں چھینے گئے مالی اور سیاسی اختیارات کی بازیابی کے لیے آگے کے سفر کی کوشش کر سکیں۔

عمر عبداللہ نے انتخابات میں فتح کے بعد جہاں ریاستی تشخص اور دفعہ 370 کی بحالی کے وعدہ کو دہرایا ہے وہیں اس وعدہ کی فوری تکمیل کے امکان کو بھی خود ہی رد بھی کیا ہے۔ مبہم انداز میں البتہ انہوں نے بھارت کے ساتھ الحاق کے وقت 1947ء میں اپنے دادا شیخ عبداللہ کے ساتھ کیے گئے بھارتی حکومت کے وعدوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ قبل ازیں وہ لیفٹیننٹ گورنر کے سامنے مفلوج وزارت اعلیٰ کے منصب پر بیٹھنے سے انکار کر چکے تھے۔ تاہم انتخابات میں فتح کے بعد وزارت اعلیٰ کے منصب پر بیٹھنے کے لیے وہ کافی جلدی میں نظر آئے۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہوگی کہ بھارتی سپریم کورٹ کے احکامات کے مطابق جموں کشمیر کی ریاستی حیثیت بحال کر دی جائے۔ کیونکہ ان کی حکومت کو اپنے دعوؤں اور اعلانات پر عملدرآمد کرنے کے لیے مرکز میں حکمران بی جے پی کے رحم و کرم پر ہی رہنا ہوگا۔

5 اگست 2019ء میں جموں کشمیر تنظیم نو بل اور بعد ازاں دسمبر 2023ء میں جموں کشمیر تنظیم نو ترمیمی بل کی منظوری کے بعد بھارت کی دیگر یونین ٹیریٹریز کی اسمبلیوں کو حاصل اختیارات سے بھی جموں کشمیر کی اسمبلی کو محروم کر دیا گیا ہے۔ پولیس، پورورکسی، انارنی جزل اور پراسیکیوٹر کی خدمات پر لیفٹیننٹ گورنر کا کنٹرول ہوگا۔ تقرریوں اور تبادلوں سے متعلق امور کے لیے لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری لینا ہوگی۔ مالیاتی اختیارات بھی لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری کے محتاج ہوں گے۔ لیفٹیننٹ گورنر کا نمائندہ کابینہ کے تمام اجلاسوں میں شرکت کا پابند ہوگا اور وزرا کے شیڈول اور اجلاسوں کے ایجنڈے کم از کم دو دن پہلے گورنر کے دفتر میں جمع کروانا ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر کی جانے والی قانون سازی بھی لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری سے ہی مشروط ہوگی۔ لیفٹیننٹ گورنر کے اعتراض کے بعد اسمبلی دوبارہ کوئی بل منظور کر دے تو لیفٹیننٹ گورنر اسے منظور کرنے کے پابند ہوتا ہے۔ تاہم جموں کشمیر میں ایسا نہیں ہے۔

اس طرح عملی طور پر یہ اسمبلی ایک بلدیاتی ادارے سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی اور نئی منتخب ہونے والی حکومت اپنا جیج ہی ہوگی۔ عملی طور پر لیفٹیننٹ گورنر اور اس کے ذریعے بی جے پی کی مرکزی حکومت کی حکمرانی کا سلسلہ مستقبل قریب میں بھی برقرار ہی رہے گا۔

نیشنل کانفرنس کی ساری تاریخ اور جموں کشمیر کے بھارت کے ساتھ سیاسی تعلق کو اگر دیکھا جائے تو 1947ء میں

ہنگامہ دیش کے طالبہ تھریکے



دریاؤں کے دل جس سے دل جاگیں وہ طوفان!

تحریر: عمر عبداللہ

دنیا بھر کی طرح جنوب ایشیا بھی پچھلے کچھ سالوں سے غیر معمولی سیاسی و سماجی ہلچل سے گزر رہا ہے۔ 2022ء میں سری لنکا میں طلبہ اور محنت کشوں کی احتجاجی تحریک کی جانب سے بدعنوان اور عوام دشمن صدر راجا پکسے کو بھانگنے پر مجبور کیے جانے کے بعد سے اٹھنے والی شورش کی لہر پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ طویل عرصے کی شکستوں یا بے عملی کے بعد صرف پچھلے چھ مہینوں میں خطے کے طلبہ اور محنت کش عوام نے اپنے بلند حوصلوں اور قربانیوں سے دو بڑی کامیابیاں سنبھالی ہیں۔ ایک طرف نوجوانوں کے ہراول کردار کے ساتھ پاکستانی زیر انتظام جموں کشمیر کے عوام نے پورے نو آبادیاتی ریاستی سیٹ اپ کو شکست دے کر سستی بجلی کا بنیادی حق چھینا ہے تو دوسری طرف ہنگامہ دیش میں طلبہ نے طویل عرصے سے اقتدار کے ساتھ چٹائی حسینہ واجد کی آمرانہ حکومت کا تختہ الٹ کر اسے ملک سے بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسی طرح کلکتہ میں نوجوان ڈاکٹر کے رپ اور قتل کے خلاف ڈاکٹر اول اور طلباء و طالبات کی تحریک سے لے کر پختونخواہ اور بلوچستان میں قومی جبر، سامراجی جنگوں اور آپریشنوں کے خلاف مزاحمتی تحریکوں کے ابھار سمیت اس وقت خطے میں متعدد چھوٹی بڑی سرگشتیاں مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں جو آنے والے دنوں میں طبقاتی کشمکش کے بڑے طوفانوں کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔

عام لوگ مسلسل گہرے ہوتے ہوئے معاشی بحران، سرمایہ دارانہ ریاستوں کی تاریخی ناکامیوں، آئی ایم ایف اور دیگر مالیاتی اداروں کی نیولبرل معاشی پالیسیوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ نیولبرل حکومتوں اور عالمی اداروں کے کاغذوں پر اعداد و شمار کے ہیر پھیر سے گھڑی گئی ترقی کی بوگس دیو مالائی داستانوں کی اصل حقیقت بھی اب کھل کر سامنے آنا شروع ہو چکی ہے۔ دنیا کے اس حصے میں آبادی کا ساٹھ سے ستر فیصد تک نوجوانوں پر مشتمل ہے جنہیں ان حالات میں اپنا مستقبل مسلسل تاریک ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ ایک طرف عالمی سامراج اور ان کے مقامی گماشتوں کی نمائندہ ریاستوں کے پاس اس کثیر جیتی بحران میں مروجہ پالیسیوں کو ہی جبراً نافذ کرنے اور ہر مزاحمت کو خون میں نہلا کر کچل دینے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے تو دوسری طرف اربوں محنت کشوں بالخصوص ان کی نئی نسل کے پاس بھی اپنی زندگیوں کی بقا اور بہتر مستقبل کی امید کی خاطر لڑنے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں بچا۔ اس ساری کیفیت کا عکس ہنگامہ دیش کی حالیہ طلبہ تحریک کے دوران ایک نوجوان کے پولیس کے ساتھ لڑتے ہوئے ہندوؤں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جانے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ پولیس اس نوجوان کے سینے پر تین مرتبہ فائر کرتی ہے مگر ہر بار وہ زمین پر گر کر پھر سے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنا سینہ آگ لگتی ہندوؤں کے سامنے دوبارہ تان لیتا ہے۔ یہ منظر تاریخ میں ظالم کے خلاف مزاحمت اور جرات کے استعارے کے طور پر

ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ہنگامہ دیش کی تحریک نے اس طرح کے بے شمار استعاروں کو جنم دیا ہے جنہیں سوشل میڈیا کی بدولت پوری دنیا نے براہ راست دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس تحریک نے ہنگامہ دیش کے اندر اور باہر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو اپنے اسباق کے ساتھ آنے والے دنوں میں دنیا بھر میں طبقاتی جدوجہد کی آگے کی جہتوں اور راستوں کا تعین کریں گے۔ جیسا کہ ہم پاکستان میں طلبہ کے حالیہ مظاہروں کی صورت میں دیکھ بھی رہے ہیں۔

10 جولائی 2024 کو ہنگامہ دیش کی سپریم کورٹ نے سول سروس کی تین ہزار سیٹیوں پر 2018ء سے منسوخ شدہ کوٹہ سسٹم بحال کر دیا۔ اس سسٹم کے تحت 30 فیصد سیٹیوں جنگ آزادی میں لڑنے والے خاندانوں کے لیے اور مزید 26 فیصد خواتین، معذوروں، اقلیتوں اور پسماندہ اضلاع کے لیے مختص تھیں۔ ماضی میں کچھ بھی رہا ہو لیکن اب یہ اول الذکر 30 فیصد کوٹہ حسینہ واجد اور عوامی لیگ کے ہاتھوں میں ایک اوزار بن چکا تھا جسے وہ سیاسی رشوت، بدعنوانی اور ریاست کے اندر اپنے حمایتی لوگوں کا غلبہ برقرار رکھ کر اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ دوسری طرف پڑھے لکھے نوجوانوں کو ان سرکاری نوکریوں کے علاوہ کوئی اور مناسب روزگار میسر نہ تھا۔ چنانچہ طلبہ نے اس متعصبانہ پالیسی کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس مظہر سے بھی نام نہاد نیولبرل معاشی ترقی کے فراڈ کا پول بھی کھل جاتا ہے کہ مبینہ طور پر تیز ترین

ہنگلہ دیش طلبہ تحریک

مرزی ہی سہی لیکن ان ویڈیوز کا تاثر اپنے اندر بہت اہمیت رکھتا تھا کہ اس متروک نظام کی چکی میں مسلسل پسے والے ان نوجوانوں کو اگر موقع دیا جائے تو ان میں اتنی شغلی اور حوصلہ ہے کہ یہ اس موت بانٹنے سیارے پر زندگی کی بہار پیدا کر کے دکھا دیں گے۔ اور ماتم ہی کیا جاسکتا ہے اس عقل پر جو ایک ایسی تحریک میں رجعت تلاشتی ہے یا یہ بھتی ہے کہ جماعت اسلامی جیسی فسطائی قوتیں ایسی تحریک میں پنپ سکتی ہیں جس میں خواتین کی اتنی بڑی تعداد فرٹ لائز پر لڑ رہی ہو۔

اس بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگرچہ 1971ء میں ہنگلہ دیش کی تحریک سوشلسٹ انقلاب تک کا سفر طے نہ کر سکی جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان سے آزاد ہونے کی پانچ دہائیوں کے بعد بھی محنت کش طبقہ کی زندگی کی تلخی میں کوئی کمی نہیں آئی اور شاید کئی حوالوں سے حالات پہلے سے بدتر ہو چکے ہیں۔ لیکن اس ادھورے پن میں بھی اس تحریک کی بہت ساری سیاسی و نظریاتی حاصلات اور اسباق ہیں جن میں بنیاد پرستی کی کمرٹ کا جانا اور لسانی و قومی حوالے سے کسی حد تک ایک سبھا قوم پرستی کی ریاست کی تشکیل شامل ہے۔ اگرچہ تحریک آزادی کی روایتی پارٹی عوامی لیگ کے اس عبرت ناک انجام کے بعد بی این پی جو کہ ایک سنٹر رائٹ جماعت ہے اور بنیاد پرستی میں اپنی جڑیں رکھتی ہے کے لیے بھی مواقع کی کھڑکی کھلی ہے لیکن بنیاد پرستی کے ہنگلہ دیش سماج پر حاوی ہو جانے کے امکانات کم از کم فی الوقت ناپید ہیں۔ بنیاد پرستی کا حاوی ہونا تو درکنار تحریک کی موجودہ کیفیت میں تو بی این پی کا اقتدار حاصل کرنا بھی اتنا آسان نہیں ہو گا۔ کابینہ میں موجود تحریک کے دونوں رہنماؤں نے یہ واضح کیا ہے کہ اگرچہ اس عبوری حکومت کا کام الیکشن کرا کے اقتدار منتقل کرنا ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ریاست اور خاص طور پر الیکشن کمیشن میں ایسی سرکچرل اصلاحات سے پہلے الیکشن کرائے جائیں جن کے ذریعے فسطائیت یا آمریت کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روکا جا سکے۔ دوسری طرف طلبہ تحریک اور اس کی قیادت یہ چاہتی ہے کہ الیکشن سے پہلے انہیں کچھ وقت مل جائے تاکہ وہ پارٹی بنالیں جس کی سر توڑ کوششیں بھی جاری ہیں۔ یہ طلبہ اگر معقول مطالبات، پروگرام اور حکمت عملی کے ذریعے محنت کش طبقے کو بھی اپنے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آئندہ انتخابات غیر معمولی نتائج اور مضمرات کے حامل ہوں گے۔ لیکن اس کے امکانات بہت زیادہ نظر نہیں آرہے ہیں۔

طلبہ اپنی حدت اور شورش سے محنت کش طبقے کے اندر تحریک کو پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس سے آگے کے مراحل میں کسی

9 نمائندے اسی تنظیم کے تھے۔ یہ تنظیم سنٹر لیٹ ڈیموکریٹک نظریات رکھتی ہے اور اس کے علاوہ بھی اس کمیٹی میں جو بعد ازاں 32 رکنی سے بڑھ کر 159 رکنی ہو چکی ہے میں بائیں بازو کے نظریات رکھنے والی متعدد تنظیمیں شامل ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ہندوستانی ریاست نے تحریک سے خوفزدہ ہو کر اور سٹالینسٹ رجحانات نے تحریک سے باہر رہ جانے کے غم میں اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے احتجاجی طلبہ کے خلاف انتہائی غلیظ اور زہریلا پراپیگنڈہ کیا۔ دونوں نے اپنی پوری طاقت سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس تحریک پر بنیاد پرست تنظیمیں خاص طور پر ہنگلہ دیش کی کالعدم جماعت اسلامی کا قبضہ ہے اور ہنگلہ دیش آنے والے دنوں میں افغانستان بننے جا رہا ہے۔ پاکستانی ریاست اور یہاں کی جماعت اسلامی کے پراپیگنڈہ نے بھی اس تاثر کو تقویت دی۔ یہ بات درست ہے کہ تحریک کے دوران حسینہ واجد کے بھاگ جانے کے بعد ایک وقت ایسا ضرور آیا تھا جب غیر یقینی صورتحال کا فائدہ اٹھا

ترقی کی سہری مثال ہنگلہ دیش کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان صرف تین ہزار نوکر یوں کی خاطر لڑ مر جانے کو تیار ہیں۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو طلبہ نے یکسر مسترد کر دیا اور احتجاج میں کود گئے۔ طلبہ کا اس قدر تیزی سے احتجاج میں منظم ہو جانا کوئی حادثہ نہیں تھا بلکہ 2018ء کی طلبہ تحریک کا تسلسل تھا جس نے حسینہ واجد کو اس کوڈ سسٹم کو منسوخ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان مظاہروں میں بھی سینکڑوں نوجوانوں نے جان کی قربانی دے کر اپنے مطالبات منوائے تھے۔ اس تحریک کے دوران ہنگلہ دیش سدھاروں چھاترا اودھیکر سوگر وکون پریشد (ہنگلہ دیش جنرل سٹوڈنٹس رائٹ پروٹیکشن کونسل) ابھر کر سامنے آئی تھی۔ چھ سال بعد جب اسی کوڈ کو سپریم کورٹ کے ذریعے دوبار لاگو کرنے کی کوشش کی گئی تو ہنگلہ دیشی طلبہ کے پاس نہ صرف تحریک کا تجربہ موجود تھا بلکہ ان چھ سالوں میں طلبہ نے کسی حد تک اپنی تنظیم اور قیادت بھی تخلیق کر لی تھی۔ اس بار تحریک کی قیادت 'ایمئی ڈسکریمینیشن سٹوڈنٹس موومنٹ' (تعصب و تفریق مخالف طلبہ تحریک) نامی 23 رکنی کوارڈینیٹرز کی کمیٹی



کر بنیاد پرستوں نے تحریک آزادی کی یادگاروں اور شیخ مجیب الرحمان سمیت دیگر آزادی کے ہیروز کے جسموں کو نقصان پہنچایا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ مندروں پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ لیکن انتہائی پھرتی کے ساتھ تحریک کی قیادت نے فوراً ملک بھر میں کمیٹیاں تشکیل دے کر سکیورٹی کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہی وہ وقت تھا جب سوشل میڈیا پر تحریک کی فتح کے بعد نوجوان طلبا و طالبات کی جانب سے ٹریفک کا نظام سنبھالنے کی ویڈیوز وائرل ہوئیں اور خطے کے نوجوانوں کے لیے ٹھنکے کے ماحول میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بنیں۔ کسی حد

کر رہی تھی جس کا قیام سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلے کے رد عمل میں ہوا اور جس میں ناہیدالسم اور آصف محمود بھی شامل تھے جو بعد ازاں اس تحریک کا چہرہ بن کر ابھرے اور موجودہ عبوری حکومت میں ایڈوائزر بھی ہیں۔ یہ دونوں 26 سالہ نوجوان ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں اور دونوں 'گائونٹنرک چھاترا شکتی' (ریپبلکن سٹوڈنٹس پاور) کے ڈھاکہ یونیورسٹی پونٹ کے جنرل سیکرٹری اور کونویز ہیں۔ 'گائونٹنرک چھاترا شکتی' بنیادی طور پر 2018ء میں کوڈ موومنٹ کی قیادت کرنے والی سدھاروں چھاترا اودھیکر سوگر وکون پریشد سے علیحدہ ہوئی تنظیم ہے اور حالیہ تحریک کی مذکورہ 23 رکنی کمیٹی میں

بنگلہ دیش طلبہ تحریک

پائی۔ اس کا واضح اظہار طلبہ کی طرف سے ڈاکٹر یونس جیسے نوسر باز اور نیولبرل سامراجی گماشتے کو عبوری حکومت کا چیف ایڈوائزر بنانے کے مطالبے میں بھی ہوتا ہے۔ وہ ایک بینکار



بنگلہ دیش کی حالیہ تحریک طلبہ تک ہی محدود ہو جانے سے فی الوقت پیٹی بورڈ اور جمہوری امنگوں سے آگے نہیں بڑھ پائی۔ اس کا واضح اظہار طلبہ کی طرف سے ڈاکٹر یونس جیسے نوسر باز اور نیولبرل سامراجی گماشتے کو عبوری حکومت کا چیف ایڈوائزر بنانے کے مطالبے میں بھی ہوتا ہے۔

کی انتہائی پرفریب مکاریاں زیادہ واضح ہو کے سامنے آئیں گی اور سب سے پہلے طلبہ کی زیادہ باشعور پرتوں کے سامنے یہ عیاں کریں گی کہ کسی انسان دوست سرمایہ داری کی گنجائش اس زماں و مکاں میں موجود نہیں ہے۔ یہ نظام ایک بہت چھوٹی سی مراعت یافتہ اقلیت کے علاوہ باقی انسانوں میں غربت، موت، جبر اور ذلت ہی بانٹ سکتا ہے۔

بنگلہ دیش کی عمومی معاشی کیفیت مسلسل گراؤ کا شکار ہے۔ آئی ایم ایف پروگرام، نجکاری، کٹوتیوں، بجلی کی قیمتوں میں اضافے، بیرونی گاری، مہنگائی، سکڑتی اجرتوں اور کام کرنے کے انتہائی برے حالات کے خلاف محنت کش طبقے کے اندر ایک تحریک پک رہی ہے جو گاہے بگاہے چھوٹے بڑے احتجاجوں اور ہڑتالوں میں اپنا اظہار بھی کرتی نظر آتی ہے۔ طلبہ کی حالیہ تحریک جہاں بنگلہ دیش کے اندر اور باہر آنے والی تحریکوں کے لیے اپنے اسباق چھوڑ جائے گی وہاں ناگزیر طور پر محنت کش طبقے کے تاریخ کے میدان عمل میں اترنے کی پیش رفت کو بھی ہمیز دے گی۔ جب دنیا کی نصف سے زائد ٹیکسٹائل مصنوعات پیدا کرنے والا بنگلہ دیش کا دیوبہکل پروڈکٹر رہے پیش قدمی کرے گا تو نہ صرف جنوب ایشیا بلکہ ساری دنیا کا منظر نامہ بدل کے رکھ دے گا۔

ہے جسے مائیکرو فنانسنگ کے ذریعے غربت مٹانے کی ایسی پالیسی پر نوبل انعام دیا گیا تھا جو درحقیقت ایک فراڈ تھا۔ المیہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش کی حالیہ صورتحال خود ڈاکٹر یونس کی پالیسیوں کی ناکامی کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن پیٹی بورڈ وازی سے تعلق رکھنے والے طلبہ (بالخصوص یونیورسٹیوں تک پہنچ سکنے والے) ایسی نسبتاً مراعت یافتہ سماجی پرت سے تعلق رکھتے ہیں جن کے شعور پر ڈاکٹر یونس یا عبدالستار ایدھی یا دوسری ایسی اصلاح پسند شخصیات اور رجحانات، جنہیں حکمران طبقات تعلیمی نصابوں اور میڈیا کے ذریعے خوب ابھارتے ہیں، ایک بوجھ کی طرح سوار ہوتے ہیں۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب محنت کش طبقہ مجبور ہو یا سیاسی و نظریاتی کمزوریوں سے دوچار ہو۔ اگرچہ ناہید اسلم اور دیگر طلبہ پر عزم ہیں کہ وہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے عوام دوست جمہوری اور معاشی اصلاحات کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن وقتی کامیابیوں کے باوجود یہ آئیڈیلزم آج نہیں تو کل ناگزیر طور پر تنقید مادی حقائق سے ٹکرائے گا۔ سامراجی و مقامی حکمران فی الوقت پسپا ہوئے ہیں لیکن لمبے عرصے میں وہ طلبہ کو بغاوت کی سزا دینے کا کوئی موقع گنوانیں گے نہیں۔ ان گنت قربانیوں سے قومی آزادی حاصل کرنے کے باوجود بنگلہ دیش میں بھی ایک سرمایہ دارانہ

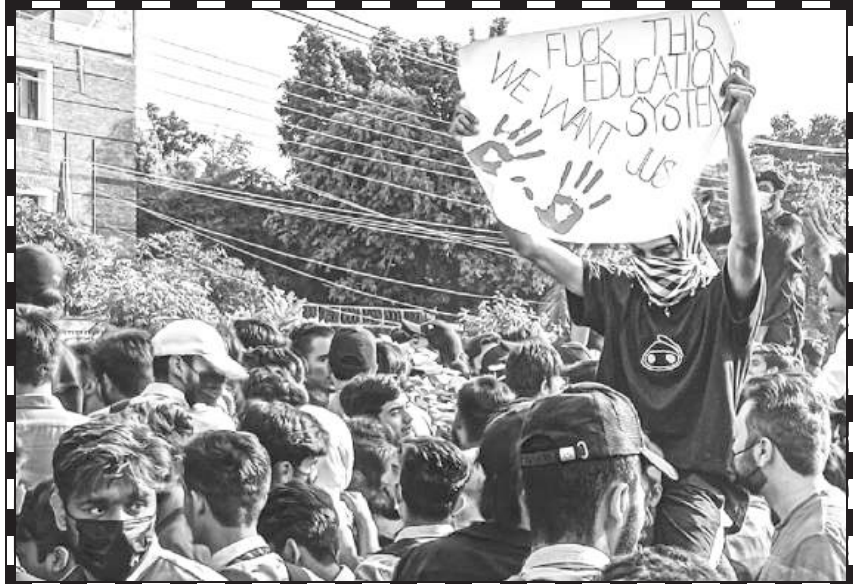
خاطر خواہ انقلابی پیش رفت کے لیے پھر محنت کش طبقے کا ہر اول کردار ضروری ہو جاتا ہے۔ حالیہ تحریک میں محنت کش کسی حد تک شامل تو ضرور ہوئے لیکن بحیثیت طبقہ یا سیاسی فاریشن کے نہیں بلکہ عوام کی صورت میں۔ بہر حال ایک نئی پارٹی تو ہر دو صورتوں میں ضرور بنے گی لیکن صرف طلبہ پر مشتمل اگر کوئی پارٹی بنتی ہے تو اس کی اپنی محدودیت رہے گی۔

تحریک کے خلاف ایک اور ہیروہ پراپیگنڈہ یہ کیا جا رہا ہے کہ چونکہ طلبہ نے ڈاکٹر یونس کو بلا کر عبوری حکومت کا چیف ایڈوائزر بنوایا ہے جو مغربی سامراج اور عالمی مالیاتی بیوروکریسی کا منظور نظر ہے اور دوسری طرف حسینہ واجد یہ کہہ رہی ہے کہ امریکہ کو ایپسٹولٹی ٹاٹ، کہنے پر مجھے سازش کے ذریعے نکالا گیا ہے لہذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ساری تحریک کے پیچھے سی آئی اے کا ہاتھ تھا۔ سی آئی اے تو کیا دنیا میں کوئی بھی سامراجی طاقت مصنوعی بنیادوں، طریقوں یا سازش کے ذریعے ایسی تحریکیں برپا نہیں کر سکتی جن میں لاکھوں نوجوان شامل ہوں اور تحریک کی خاطر سینکڑوں کی تعداد میں جانوں کا نذرانہ پیش کر دیں۔ تحریکیں موضوعی عناصر کی مرضی اور ان کے ذہن میں موجود خاکوں کے عین مطابق نہیں ابھرتیں۔ بالخصوص تحریکوں کے ابھار یا شروعات کے حوالے سے موضوعی یا ”بیرونی“ عناصر (چاہے رجحانی ہوں یا انقلابی) زیادہ سے زیادہ پہلے سے جاری معروضی عوامل کو جزوی ہمیز یا تقویت ہی دے سکتے ہیں۔ مزید برآں بالفرض کسی سامراجی یا داخلی رجحانی رجحان کے مفادات وقتی طور پر کسی عوامی تحریک سے میل کھاتے ہیں تو اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہوتا کہ تحریک ان کی مرضی یا ایما سے چل رہی ہے۔

سماج کے اپنے ارتقا کے دوران طبقاتی کشاکش اور فوری واقعات کے زیر اثر تحریک کے ابھرنے، پسپا ہونے یا آگے بڑھ جانے میں موضوعی عنصر کے علاوہ کئی اور محرکات بھی شامل ہوتے ہیں جس کے باعث تحریکوں کی ایک آزادانہ حرکت بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعی عنصر کی مکمل غیر موجودگی میں بھی تحریکیں ابھرتی ہیں اور انتہائی ٹھوس موضوعی عنصر کے ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات تحریکیں برپا نہیں ہو پاتیں۔ خالصتاً انقلابی تحریک دانشور دماغوں میں ہی وجود رکھتی ہے۔ اس لیے انقلابیوں کا یہ کام نہیں ہے کہ جو تحریکیں ان کی خواہشات کے تابع نہ ہوں ان پر فتوے بازی کرتے پھریں بلکہ ان کے سامنے ہمیشہ یہ سوال ہونا چاہیے کہ ان میں مداخلت کر کے انہیں انقلابی عمل کی طرف موڑا کیسے جائے اور اپنی قوتوں اور اثر و رسوخ میں اضافہ کیسے کیا جائے۔

بنگلہ دیش کی حالیہ تحریک طلبہ تک ہی محدود ہو جانے سے فی الوقت پیٹی بورڈ اور جمہوری امنگوں سے آگے نہیں بڑھ

طلبہ احتجاج: ان کے غصے میں خوشبو بغاوت کی ہے!



تحریر: اویس قرنی

ماہ اکتوبر کے وسط سے لاہور کے پنجاب کالج سے پھوٹنے والے طلبہ مظاہرے، جو کئی شہروں تک پھیل گئے، درحقیقت سماجی سطح کے نیچے پلنے والی نفرت، غصے اور مسلسل عدم اطمینان کا اظہار تھے۔ ان مظاہروں کی شدت اور ان میں شریک کالج کے طلباء و طالبات پر ہونے والی بدترین پولیس گردی نے اس بحث کو بے معنی بنا دیا ہے کہ مظاہروں کا موجب بننے والے لمبنہ زیادتی کے واقعے کی حقیقت کیا ہے۔ پنجاب گروپ آف کالجوں تعلیم کے دھندے میں ایک ٹائیکلون کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ریاست نے اس منافع بخش سرمایہ کاری کی حفاظت کی خاطر انٹرمیڈیٹ کے معصوم بچوں پر ایسی یلغار کی کہ لاہور، راولپنڈی اور گجرات جیسے شہروں کی شاہراہیں جنگی محاذ کا منظر پیش کرتی رہیں۔ ایک طرف نہتے بچے، بالخصوص بچیاں تھیں۔ دوسری جانب لاشیوں، بندوٹوں، بکتر بند گاڑیوں اور ان گنت آنسو گیس کے شیلوں سے مسلح ریاستی اہلکار۔ سولہ سترہ سال کے بچوں پر بدترین تشدد کے علاوہ سینکڑوں کو گرفتار بھی کیا گیا۔ لیکن ان بے باک مظاہروں نے اس نسل سے متعلق تمام مغالطوں کے پہاڑوں کو زبیں بوس کر دیا اور اس دعوے پر مہر تصدیق ثبت کی کہ نئی نسل جبر و استحصال پر پڑی اس نظام کے لیے ماضی سے کہیں بڑا چیلنج ہے۔ نوجوانوں کی اس محدود لیکن دیرانہ لڑائی کا کئی زاویوں سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس بات کا بھی گہرائی میں مشاہدہ درکار ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد میں کس طرح نوجوانوں کی اس دیوبہل شہتی کو حکمران دھڑوں کے مختلف رجحانات اپنی داخلی لڑائیوں، عدم استحکام اور انتشار کی جانب دھکیلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حالیہ مظاہروں کو تحریک انصاف کی رجعتی سوشل میڈیا مشینری اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی نظر آئی۔ شخصیت پرستی اور زر گسیت پر مبنی ایسے رجحانات اس قدر سفاک ہوتے ہیں کہ اپنے گھٹیا اور معمولی قسم کے عزائم کے لیے معصوم بچوں کی جھینٹ چڑھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

حالیہ مظاہروں میں سب سے بنیادی سوال یا نکتہ یہ ہے کہ جنسی تشدد اور ہراسانی کو اس بحران زدہ سرمایہ داری نے ایک سماجی معمول بنا دیا ہے تو پھر ایک اور واقعہ، جس کے بظاہر شواہد بھی موجود نہیں، بدترین ریاستی خوف اور جبر کے ماحول کے باوجود نوجوانوں کو اس قدر بڑے پیمانے پر احتجاج کرنے

ماہ اکتوبر کے وسط سے لاہور کے پنجاب کالج سے پھوٹنے والے طلبہ مظاہرے، جو کئی شہروں تک پھیل گئے، درحقیقت سماجی سطح کے نیچے پلنے والی نفرت، غصے اور مسلسل عدم اطمینان کا اظہار تھے۔

ان مظاہروں کی سب سے خاص بات طلبہ کا نجی تعلیمی اداروں کی دھونس اور بد معاشی کو سہتے رہنے سے انکار تھا۔ آج تمام نجی تعلیمی ادارے بالخصوص کالجوں کا قاعدہ میل خانہ جات کی طرز پر چلائے جا رہے ہیں۔ بیشتر نجی یونیورسٹیوں کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ ادارے کے مرکزی گیٹ میں سے داخل ہونے کے بعد ہر نوجوان ایک نفسیاتی ہچان اور خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کہاں اور کیسے کھڑا ہونا ہے؟ بیٹھنا کیسے اور کہاں ہے؟ کس سے اور کیا بات کرنی ہے؟ کیا پہننا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہر لمحہ نوجوان خود کو ایک جعلی اور رجعتی ڈسپلن کا پابند اور قیدی محسوس کرتے ہیں۔ آزادی سے سانس لینا تک دشوار ہے۔ سوچوں پر پھرے ہیں۔ کلاس روموں کے اندر اور باہر ہر جگہ تذلیل ہے۔ بھاری بھر کم فیسیں ہیں لیکن مستقبل تاریک۔ یہ مظاہرے نجی تعلیمی اداروں کی اسی جاہلانہ روش کے خلاف ایک انتہا تھے۔ جنہوں نے واضح کیا ہے کہ نجی تعلیم حاصل کرنے والے نسبتاً مراعت یافتہ نوجوان بھی بغاوت پر اتر سکتے ہیں اور لڑنے مرنے کی حد تک جاسکتے ہیں۔

تاریخ بڑی ستم ظریف ہے۔ منافعوں کے حصول کے لیے ملک بھر میں پنجاب گروپ آف کالجوں کے بچھائے ہوئے جال نے ہی ان احتجاجوں کی وسعت اور پھیلاؤ میں اہم کردار

پر کیسے آمادہ کر سکتا ہے؟ مروجہ سوچ یا رسمی منطق کے حساب سے یہ ایک بھگانہ عمل ہے جس کی کوئی ضرورت یا جواز نہیں بنتا تھا۔ لیکن محنت کش عوام کی نسبتاً بے عملی کے بظاہر شانات اور غیر انقلابی وقوتوں میں بھی سماج کی بالائی تہہ کے نیچے مسلسل لاوا پک رہا ہوتا ہے۔ جبر، پابندیوں اور محرومیوں کے خلاف حقارت اور نفرت کی شدت بڑھتی جاتی ہے۔ جسے کوئی بہانہ، کوئی موقع چاہئے ہوتا ہے۔ یہ لاوا جب پھٹ پڑتا ہے تو عام حالات میں جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا جرم بنا دیا گیا ہوتا ہے لوگ اسے مجسم کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ ان ابوانوں کو آگ لگا دیتے ہیں جہاں ان کی شنوائی نہیں ہوتی۔ استحصالی سرمایہ داری نظام کی علامت سمجھے جانے والے ٹیکوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس نظام کی پولیسنگ کرنے والوں پر زمین تنگ کر دیتے ہیں۔ طلبہ کے حالیہ مظاہروں میں اسی کیفیت کی جھلک نظر آئی ہے۔ طلباء و طالبات نے سب سے پہلے ان کیسے عمارات کو نقصان پہنچایا جو دراصل جیلوں سے کم نہیں ہیں۔ ان بسوں کو جلایا گیا جن میں عام حالات میں انہیں فیس دینے کے باوجود سیٹ نہیں ملتی۔ ان سکیورٹی گارڈز کو غیض و غضب کا نشانہ بنایا گیا جو انتظامیہ کی ایما پر ان کی ہر روز تذلیل کرتے ہیں اور تعلیمی اداروں میں ریاستی دھونس کی علامت بن چکے ہیں۔

طلبہ احتجاج

ہر سانی کے واقعات پر انکوائری رپورٹوں کے احکامات صادر ہوئے لیکن آج تک ان کے نتائج کو منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ پیش رفت نہایت خوش آئند اور متاثر کن ہے۔ فی الوقت یہ مظاہرے تھمتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہر تحریک اپنے منطقی انجام



تک نہیں پہنچتی۔ یہ پشیمانی یا پریشانی کا باعث نہیں ہونا چاہیے کہ چینی بورڈر واے صبر سے پن میں ”واردات“ کے ذریعے تحریکیں چلانے یا ان پر سوار ہونے کی کوشش کی جائے۔ انقلاب کے نام پر کی جانے والی ایسی مکاری اور عیاری کو لوگ کبھی نہیں بھولتے۔ انقلاب ایک صبر آزما کام ہے جو دیانتداری اور سچائی کا متقاضی ہوتا ہے۔ نامکمل تحریکیں بھی آنے والی بناؤتوں کے لیے اہم اسباق چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ ادراک نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ جن مسائل کے خلاف غصے اور نفرت کو حالیہ طلبہ احتجاجوں میں اپنے اظہار کا موقع ملا ہے ان کا اس بوسیدہ استحصالی نظام میں خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ شورش دوبارہ بھڑکے گی اور زیادہ شدت کے ساتھ بھڑکے گی۔ ایسے حالات کی تیاری کی ذمہ داری انقلابیوں پر عائد ہوتی ہے۔

پوری دنیا میں سرمایہ داری کو نہ صرف بحران کا سامنا ہے بلکہ طلبہ و محنت کشوں کی مسلسل تحریکیں بھی ہر طرف ابھر رہی ہیں۔ عامیانا اور قدامت پرستانہ سوچ آئی ٹی انقلاب اور سوشل میڈیا کے عہد کی نئی نسل پر ہمیشہ طعنہ زن رہی ہے۔ لیکن سامراجی ریاست کے گڑھ میں ابھرنے والے ان احتجاجوں نے مستقبل کے امکانات بالکل واضح کر دیے ہیں۔ یہ نسل اپنے سے پہلے والوں سے زیادہ محرومی اور نفسیاتی ہیجان کا شکار ہے۔ مسلسل انتشار اور بحران میں اپنے والے یہ نوجوان شدید غیر یقینی سے دوچار ہیں۔ لیکن ان کی لڑائی طبقاتی جدوجہد کے نصب العین اور مقاصد سے ہی ہم آہنگ ہے۔ اسرائیلی جارحیت کے خلاف عالمگیر تحریک سے لے کر لبنان، جلی، سری لنکا، سوڈان اور بنگلہ دیش میں ہونے والی بناؤتیں نئی نسل کی انقلابی صلاحیتوں کی گواہ بنی ہیں۔ مزدور تحریک کی انقلابی اٹھان کے ساتھ نوجوان طلبہ کی جڑت وقت کا دھاراموٹ کے رکھ سکتی ہے۔

بلوچستان یونیورسٹی، اسلام آباد یونیورسٹی بہاولپور یا پھر مالاکنڈ یونیورسٹی سب جگہ معاملہ دبا دیا گیا۔

اس بات کا ادراک بھی ضروری ہے کہ جنسی تشدد و ہراسانی کوئی ذاتی یا انفرادی نوعیت کا عارضہ نہیں بلکہ ایک معاشرتی مظہر ہے اور اب استحصال اور جبر پر مبنی اس نظام تعلیم میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ طلبہ جو اس شعبہ کی بنیاد ہیں ان کا کردار محض فیسوں کی ادائیگی تک مقید کرتے کرتے انہیں ادارہ جاتی پالیسیوں اور تعلیمی نظام کی تشکیل کے عمل سے یکسر کاٹ دیا گیا ہے۔ طلبہ یونین پر ضیا آمریت کی لگائی پابندی آج تک بدستور قائم ہے۔ بلکہ آج کی تمام مین سٹریم سیاسی پارٹیوں کے دور اقتدار میں اس قدغن کو سخت ہی کیا گیا ہے۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنا ”ترقی پسندی“ کا امیج بنانے کے لیے جوش میں طلبہ یونین بحالی کی بات تو کی لیکن کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

تعلیمی اداروں میں ایسے مسائل کے خلاف جدوجہد این جی اوز کے نسخوں یا حکومتی ٹریننگ اور ورکشاپوں وغیرہ کے ذریعے ممکن نہیں۔ محض قانون ساز یوں سے بھی بات بننے والی نہیں۔ بلکہ تعلیمی اداروں کی عملداری اور فیصلہ سازی میں طلبہ کی فعال شمولیت کے ذریعے سے ہی کوئی بہتری لائی جا سکتی ہے۔ حکمرانوں کے جھانسنے میں آئے بغیر جمہوری انداز سے منتخب طلبہ کی ہراسانی مخالف کمیٹیوں کی تشکیل اور ادارے کے معاملات میں اپنی آواز اٹھانے کا حق حاصل کرنے کی جدوجہد اس جانب ایک اہم قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

حالیہ خود رو مظاہروں نے یقیناً گہرے سماجی عدم اطمینان کی کیفیت کو آشکار کیا ہے لیکن خود رو تحریکوں کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ زماں و مکاں میں اپنی محدودیت کے باوجود یہ

ادا کیا۔ اس ”گروپ آف کالجز“ کی بدنام زمانہ انتظامیہ نے ہمیشہ دھونس اور بد معاشی کو طلبہ کو کنٹرول کرنے کا کلیہ بنایا۔ لیکن پھر طلبہ کے اندر مسلسل جتمع ہوتے جانے والے غم و غصے کے پریش نے پھٹ کر ان کی ساری رعونت پر خاک ڈال دی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ آج کے نوجوان کو رائج الوقت سیاست، حکومت اور ریاست پر کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جب سے ان نوجوانوں نے ہوش سنبھالا ہے جو سیاسی و ریاستی کھلواڑ جاری ہے اس کے ہوتے کوئی اعتماد بن بھی کیسے سکتا ہے؟ اس پولیس کی پریس بریفنگ یا تحقیقات پر بھلا کون یقین کر سکتا ہے جو روازنہ کی بنیاد پر بدعنوانی، بھتہ خوری اور سیاسی کاسہ لیس کی نئی مثالیں قائم کرتی ہو۔ یہی کیفیت حکومتوں کی بھی ہے۔ مبینہ رپ کے واقعے کے تناظر میں بھی خود وزیر اعلیٰ پنجاب اور ان کی حکومت کے نمائندوں کے بیانات میں تضادات موجود تھے۔ جن کی وجہ سے حکومت کی رہی سہی سا کبھی خاک میں مل گئی اور ایک بڑی اکثریت نے حکومتی موقف کو یکسر مسترد کر دیا۔

سرمایہ داری کے بڑھتے بحران کے ساتھ بالخصوص پاکستان اور انڈیا جیسے معاشروں میں جنسی ہراسانی اور بلا دکار جیسے فتنہ رجحانات ایک زہری طرح سماج کے رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں۔ حکمران اشرافیہ اور ان کی ریاستوں کے رجعت اور دھناتی پر مبنی رویوں نے اس وحشت کو ایک تسلیم شدہ معمول بنا دیا ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر ایسے واقعات کی بھرمار ہے۔ لیکن کبھی وزیر اعلیٰ عظم اور اعلیٰ حکومتی عہدیدار و کٹم پلیٹنگ کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی کوئی لوکل یا امپورٹڈ مولوی مین سٹریم میڈیا پر ہراسانی اور جنسی زیادتیوں کا ذمہ دار خود خواتین، ان کے پہناوے اور بعض صورتوں میں محض ان کے وجود کو قرار دے رہا ہوتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی چچیاں، نوجوان لڑکے اور لاشیں تک اس درندگی سے محفوظ نہیں۔

پھر ایسے فسطائی رجحانات بھی ہیں جو ہراسانی کے معاملے کو ”بیہودگی“ اور پردے کیساتھ جوڑ کے بچپوں کی تعلیم کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ڈسکو قسم کے مولوی سوشل میڈیا پر گانوں وغیرہ کے ذریعے خواتین کی تعلیم کے خلاف ذہنوں میں گندا نڈیل رہے ہیں اور ریاست خاموش تماشا بنی ہوئی ہے۔ یہ جنونی عناصر بچیوں سے تعلیم کا حق ہی چھین لینے کے درپے ہیں۔ حالانکہ مدرسوں کے اندر لگی گنا بڑے اور شدید جنسی جرائم کا بازار گرم ہے۔ یہاں انٹرنیٹ فائروال بنا کر سیاسی مخالفوں کی زبان بندی کے پورے پورے ڈیپارٹمنٹ بنا دیے گئے ہیں لیکن ایسے جنونیوں کو کھلی چھٹی حاصل ہے۔

بہر حال حالیہ واقعہ کے ابہام کے باوجود تعلیمی اداروں میں یہ مسئلہ شدت سے موجود ہے تو طلبہ اس کرب کو محسوس کر کے سڑکوں پر آئے ہیں۔ ماضی قریب میں بھی

وادی سوات: تین روزہ یوتھ مارکسی سکول 2024ء کا انعقاد



آر ایس ایف پختونخواہ

ریولوشنری سٹوڈنٹس فرنٹ (آر ایس ایف) اور جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (جے کے این ایس ایف) کے زیر انتظام وادی سوات میں تین روزہ یوتھ مارکسی سکول کا انعقاد کیا گیا۔ موسم گرما 2024ء کا یہ مارکسی سکول 23 تا 25 اگست کو منعقد کیا گیا۔ ماضی قریب اور حال میں عظیم مزاحمتی اور انقلابی روایات کی حامل اس سرزمین کو بنیاد پرستی کے اندھیروں میں غرق کرنے کی بھرپور سامراجی کوششیں کی گئی ہیں لیکن اس جنت نظیر وادی میں سینکڑوں



نوعیت، جغرافیائی و سیاسی معاشی بین السامراجی لڑائیوں، یوکرائن اور غزہ میں جنگوں، ماحولیاتی بحران اور گلوبل وارمنگ، سیاسی پولرائزیشن اور بائیں اور دائیں پاپولزم کے ابھرتے ہوئے دھاروں، انتہائی دائیں بازو اور مذہبی بنیاد پرستی کی نئی شکلوں، تارکین وطن اور ہجرت کے بحران، عصری دنیا میں ہڑتالوں، عوامی تحریکوں اور بغاوتوں، سلگتے ہوئے قومی سوال اور قومی آزادی کی تحریکوں، افریقہ میں فوجی بغاوتوں، فرانس، برطانیہ، بھارت اور وینزویلا میں انتخابات، بنگلہ دیش میں طلبہ کی جفاکش تحریک، پاکستانی سرمایہ داری کے وجودی بحران اور جنوب ایشیا میں حالیہ پیش رفتوں کا عمومی تجزیہ کیا گیا۔ لیڈ آف کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا جو سیشن کے آخر تک جاری رہا۔ اس بحث میں حصہ لینے والوں میں عروج امجد، ایڈوکیٹ یاسر رسول، ممتاز آریسر، ثناء محمد، امن حبیب، اسلام شفیق، علی رضا، جنید بلوچ اور عمران کامیانہ شامل تھے جنہوں نے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے مستقبل کے مختلف امکانات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ آخر میں مجیب خان نے بحث کو سمیٹتے ہوئے سکول کے پہلے سیشن کا

میں بنیاد پرستی، سامراجیت اور سرمایہ داری کے خلاف مزاحمت اور جدوجہد کی بے باک عوامی آواز، سابقہ منتخب ناظم ضلع مالاکنڈ اور پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمیٹین کے سینئر نائب صدر ایڈوکیٹ غفران احمد نے ملک کے طول و عرض سے آنے والے نوجوان ساتھیوں کو خوش آمدید کہا اور سکول کے انتظامات و ڈسپلن کے بارے میں آگاہ کیا۔ ابتدائی کلمات کے بعد سکول کے مجموعی طور پر پہلے سیشن پر بحث کا باضابطہ آغاز کر دیا گیا۔ پہلے سیشن کو نخلہ باچا نے چیئر کیا۔ اس سیشن کے موضوع ”ہنگامہ خیز دنیا: سرمایہ داری کا کثیرالجہتی بحران اور انقلابی حل“ پر چیئر مین جے کے این ایس ایف ضلع پونچھ کا مرید مجیب خان نے تفصیل سے روشنی ڈالی اور دنیا بھر میں سرمایہ داری کے شدت پکڑتے تضادات، بحرانات اور تحریکوں کی موجودہ صورتحال اور تناظر پر بات رکھی۔ سیشن کی لیڈ آف اور کٹری بیوٹھن میں سرمایہ داری کے معاشی بحران کی نوعیت، عالمی معیشت کے جائزے، مغربی سرمایہ داری کے بحران اور امریکی سامراج کے زوال، چین کے ابھار اور اس کی معیشت اور ریاست کی

انقلابی نوجوانوں کا یہ جرات مندانہ اکٹھ جہد مسلسل اور روشن مستقبل کی نوید بنا ہے۔

انتہائی نامساعد سیاسی و معاشی حالات میں بھی سکول میں شرکت کے لئے ملک بھر اور اس کے زیر انتظام علاقوں سے سینکڑوں نوجوان 22 اگست کی شام کو عالم جبہ پہنچے جہاں آر ایس ایف پختونخواہ کی میزبان کمیٹی نے ان کا استقبال کیا۔ مارکسی سکول میں 50 خواتین سمیت 350 سے زائد انقلابی نوجوانوں نے شرکت کی۔ سکول میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) اور پروگریسو سٹوڈنٹس کلکیکو (پی ایس سی) سمیت دیگر دوست تنظیموں کے وفد نے بھی شرکت کی۔ تین روزہ مارکسی سکول کے دوران مجموعی طور پر چار بنیادی موضوعات پر بحث کے علاوہ ثقافتی و ادبی سرگرمیوں کا انعقاد بھی کیا گیا۔

23 اگست بروز جمعہ کی صبح ناشتہ کے بعد سکول میں شرکت کے لئے آنے والے تمام انقلابی نوجوان پہلے سیشن میں شمولیت کے لئے ہال میں جمع ہوئے۔ مارکسی سکول کے طے شدہ موضوعات پر بحث کے باضابطہ آغاز سے قبل خطے



باضابطہ اختتام کیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جمعہ کے روز ہی تین بجے سکول کے دوسرے سیشن کا باضابطہ آغاز کیا گیا۔ پہلے روز کے دوسرے سیشن ”مارکسی نقطہ نظر سے عصری سرمایہ داری کا سماجی و ثقافتی تجزیہ“ کے موضوع پر بحث کی گئی جبکہ اس سیشن میں چیئر کے فرائض ایڈووکیٹ ایاز بیٹو نے ادا کیے۔ اویس قرنی نے اپنی لیڈ آف میں مارکس کا فلسفہ بیگانگی، استحصا نام اشیا (Commodity Fetishism)، کنزیومرازم، منڈی کی نفسیات، پورژوا خاندان کے بحران، ترقی کے ناہموار اور مشترک پیٹرن والے معاشرے کے سماجی بحران، نسل پرستی، مذہبی بنیاد پرستی اور دہشت گردی، جرائم اور نفسیات کی لت، جنسی تشدد، سوشل میڈیا اور وائرل ہونے کی نفسیات کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو رکھی۔ جس کے بعد خاکہ باچا، ساشا جاوید، عابد بردار، انعم اختر، بخش تصدق، صائمہ بتول، فیضان طارق اور ثناء محمد نے بحث کو آگے بڑھایا اور آخر میں عمران کامیانہ نے سوالات کی روشنی میں تمام تر بحث کو سمیٹتے ہوئے سیشن کا باضابطہ اختتام کیا۔

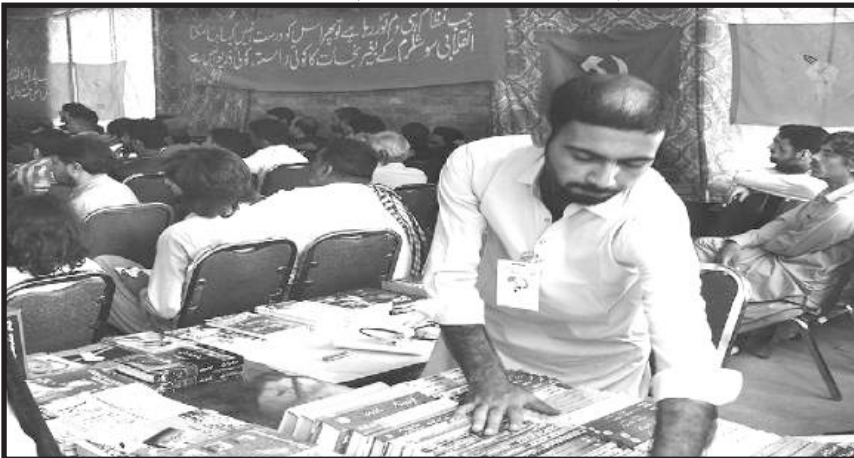
سکول کے دوسرے روز 24 اگست کی صبح بعد از ناشتہ مجموعی طور پر سکول کے تیسرے اور دوسرے روز کے واحد سیشن پر بحث کا آغاز کیا گیا۔ ”بعد از عالمی جنگ کے انقلابات، عوامی بغاوتیں اور انقلابی دھڑن تختوں کی تاریخ اور اسباق“ کے موضوع پر کامریڈ عمران کامیانہ نے تفصیلی لیڈ آف دی جبکہ ممتاز آریسر نے سیشن کو چیئر کیا۔ عمران کامیانہ نے پروتھاری بونا پارٹنزم، انحطاط شدہ اور مسخ شدہ مزدور ریاستوں، چین، کیوبا، ویتنام، افغانستان وغیرہ کے انقلابات، خطہ عرب اور افریقہ میں بائیں بازو کی فوجی بغاوتوں، 60ء اور 70ء کی دہائیوں میں دنیا بھر میں ہونے والے عوامی احتجاجات، پڑتاو اور 1968ء کی انقلابی تحریکوں، عرب دنیا میں بعث پارٹی اور بائیں بازو کی قوم پرستی کے رجحانات اور ماضی کے ان واقعات کی روشنی میں مستقبل

کے تناظر کو موضوع بحث بنایا۔ لیڈ آف کے بعد مختلف سوالات کے ساتھ بحث کو آگے بڑھانے کے لئے کنٹری بیوشنز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سیر حاصل بحث میں آصف رشید، ساجد ایوب، ڈاکٹر بشیر احمد، علیدہ اسلم، دانش فدا، سعید احمد نے حصہ لیا۔ عمران کامیانہ نے آخر میں سوالات کی روشنی میں بحث کو سمیٹتے ہوئے سکول کے تیسرے سیشن کا باضابطہ اختتام کیا۔ اس دوران مختلف کامریڈز انقلابی ترانوں اور نظموں کے ذریعے سکول کے شرکا کا جوش بڑھاتے رہے۔

سکول کے دوسرے روز دوپہر کے کھانے کے بعد ملحقہ سرسبز میدان میں ٹریکنگ اور کھیلوں کی سرگرمیوں کا انعقاد کیا گیا۔ انقلابی نوجوانوں نے ٹیلیوں کی شکل میں سیاحتی مقامات گرین ویلی اور مالم چہٹاپ غیرہ کی طرف سیر و تفریح کے لئے سفر بھی کیا۔

25 اگست بروز اتوار سکول کے تیسرے اور آخری روز ناشتہ کے بعد مجموعی طور پر سکول کے چوتھے اور آخری سیشن کا انعقاد کیا گیا۔ ”موجودہ صورتحال میں انقلابی نوجوانوں کا کردار“ کے موضوع پر بحث کا آغاز عمر عبداللہ نے کرتے ہوئے قومی اور عالمی سطح پر نوجوانوں اور طلبہ کی سرکشیوں، موجودہ دور میں نوجوانوں کو درپیش چیلنجز اور مسائل، انقلابی تحریکوں اور انقلابی پارٹی کی تعمیر میں نوجوانوں

کے کردار، طلبہ سیاست کے موجودہ حالات، بیروزگاری، بیگانگی اور تعلیمی نظام کے بحران وغیرہ جیسے نکات پر روشنی ڈالی۔ اس سیشن کو چیئر یا سر رسول نے کیا۔ اس سیشن میں تمام ریجنوں سے مختلف کامریڈوں نے اپنے اپنے خطے کی موجودہ صورتحال اور مستقبل کے لائحہ عمل اور اہداف پر تفصیلی رپورٹس بھی پیش کیں۔ اس کے بعد اوپن ڈسکشن کا سلسلہ شروع کیا گیا جس میں میزبان ریجن سے کامریڈ غفران احد نے سکول کی فنانس رپورٹ کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس تاریخی سکول کے کامیاب انعقاد پر تمام ساتھیوں کو مبارکباد پیش کی۔ اس کے علاوہ جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سابق مرکزی صدر راشد شیخ، راجیل، سقراط بلوچ، عاصمہ بتول، بی ایس او کے مرکزی چیئر مین جنید بلوچ اور عمران کامیانہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں آرایس ایف کے مرکزی آرگنائزراو اویس قرنی نے سکول کے اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ یہ سرگرمی سوشلسٹ انقلاب کے کٹھن سفر میں اہم سنگ میل ثابت ہوگی اور شرکا پورے خطے اور دنیا بھر میں انقلابی کام کو پوری جانفشانی سے آگے بڑھائیں گے۔ سکول کا باقاعدہ اختتام محنت کشوں کے عالمی ترانے انٹرنیشنل، فلک شگاف انقلابی نعروں اور فلسطین کے عوام کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا گیا۔



رپورٹ: عروہ خان

مورخہ 26 ستمبر 2024ء کو مستقل ملازمت، پنشن اصلاحات، لیبر کوڈ 2024ء اور ٹھیکیداری نظام کے خلاف میونسپل لیبر یونین (سی بی اے) کے زیر اہتمام احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ ریلی کی قیادت راجہ ہارون صدر میونسپل لیبر یونین میونسپل کارپوریشن، شاہد رضا پادری جزل سیکرٹری، ملک اشفاق نائب صدر، جاوید خان، راجہ مجید سرپرست اعلیٰ میونسپل لیبر یونین اور ٹارکیانی نے کی۔ آئی ایم ایف اور حکومت کی مزدور دشمن پالیسیوں کیخلاف احتجاجی ریلی میونسپل کارپوریشن راولپنڈی سے پریس کلب راولپنڈی تک نکالی گئی جس میں ہزاروں محنت کشوں نے شرکت کی۔ اس احتجاجی ریلی میں پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمیٹین (PTUDC)، ریولوشنری سٹوڈنٹس

راولپنڈی: یوٹیلیٹی اسٹورز کارپوریشن کے محنت کشوں کی آٹھ روزہ کامیاب جدوجہد!



کے زیر اہتمام سکولوں کی نجکاری اور آؤٹ سورسنگ کے خلاف ہزاروں مرد و خواتین اساتذہ نے راولپنڈی پریس کلب کے باہر جمع ہو کر مکملہ نجکاری اور آؤٹ سورسنگ کے

رپورٹ: عروہ خان

حکمران طبقات کی نجکاری، ڈاؤن سائزنگ، رائٹ سائزنگ، مراعات میں کٹوتیاں، جبری برطرفیاں، آؤٹ سورسنگ اور اداروں کی جزوی یا مکمل بندش جیسے مزدور دشمن اقدامات عالمی مالیاتی اداروں کے کہنے پر مختلف اداروں کے اندر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی ان وحشتوں کے تدارک کے لئے پبلک سیکٹر کے ملازمین بھی ان حملوں کے خلاف صف بندیاں کر کے حکمران طبقات کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ موجودہ حکومت نے 40 اداروں کی جزوی یا مکمل بندش، آؤٹ سورسنگ اور نجکاری کا فیصلہ کیا ہے۔ جن میں یوٹیلیٹی اسٹورز کارپوریشن بھی شامل ہے۔ اس ادارے کی 50 ارب سے زائد کی املاک میں 200 سے زائد گاڑیاں، 4 ہزار اسٹور اور 1500 فرنیچرز شامل ہیں جبکہ 2 ہزار مزدوروں اور 12 سے 14 ہزار ملازمین کا روزگار بھی اس سے وابستہ ہے۔ حکومتی اعلان کے بعد سید عارف حسین شاہ، رفیق قریشی اور راجہ مسکین نے آفیسر زایسوی ایشن کے ساتھ مل کر جو انٹ ایکشن کمیٹی بنا کر 26 اگست بروز سوموار 2024ء کو بیو ایریا ہیڈ آفس اسلام آباد کے باہر احتجاجی دھرنے کا اعلان کرتے ہوئے اس جدوجہد کا آغاز کیا۔ ہزاروں محنت کشوں نے آٹھ روزہ جدوجہد میں جس یگانگت، یکجہتی اور جوش و جذبے کا اظہار کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سلسلے میں پی ٹی یو ڈی سی سمیت ٹریڈ یونینز کے قائدین اپنے وفود کے ساتھ کارپوریشن ملازمین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لئے بھی آتے رہے۔ دلیرانہ قیادت اور ملازمین کے جوش و جذبہ نے حکومت کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور کارپوریشن کے ملازمین جیت گئے۔

راولپنڈی: ہزاروں مرد و خواتین اساتذہ کا نجکاری اور آؤٹ سورسنگ کیخلاف احتجاج

رپورٹ: پی ٹی یو ڈی سی راولپنڈی
24 ستمبر بروز منگل 2024ء کو پنجاب ٹیچرز یونین



خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا۔ احتجاجی اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے صدر قاضی عمران نے کہا کہ حکومت پنجاب کی علم دشمنی اور غریبوں سے سستی تعلیم کی سہولت ختم کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام بنائیں گے۔

راولپنڈی: میونسپل کارپوریشن کے ملازمین کا احتجاجی مظاہرہ



ASIAN MARXIST REVIEW

Special Edition
Spring 2020



Dr Lal Khan (1956-2020)
What a heart has ceased to beat!

مسلسل
اشاعت جا
35 سال

ماہوار دنیا جا پورھیتو ھک ٿي وڃو.
طبقاتي
جدوجہد
انقلابي سوشلزم جو علمبردار!

مزدور مورچہ
Mazdoor Morcha

مزدور مورچہ

پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمیٹی کا ترجمان



سرمایہ جہ
مزدور
جوان نسل کے انقلابی سیاسی شعور کا ترجمان

SUMMER MARXIST SCHOOL

23-25 August 2024, Swat



سروی لنگاہ ڈسانائیکے کی آزمائش!



THE STRUGGLE

Workers of the world unite
Vanguard of Revolutionary Socialism!

انقلابی آئین ساز اسمبلی کا قیام

آئین میں سرمایہ دارانہ نظام اور باق جبر و استبداد کو جواز فراہم کرنے والی تمام شقوں کا خاتمہ۔
محنت کشوں کے حقیقی نمائندوں پر مشتمل آئین ساز اسمبلی کا قیام جو منتخب عوامی پنچائتوں کے
جمہوری کنٹرول پر مبنی ایسے معاشرے کو تشکیل دے جس سے بنیادی حقوق کی فراہمی یقینی بن سکے۔

محنت کش

افراط زر کے ساتھ منسلک محنت کش کی تنخواہ کم از کم ایک تہ سو روپے کے برابر۔ تمام بنیادی سہولتوں
کی عوام کو مفت فراہمی۔ ہفتہ وار اوقات کار کو 35 گھنٹے کرنا۔ ٹیکس کی ادائیگی اور چائلڈ لیبر کا خاتمہ۔

صنعت اور معیشت

تمام قومی اور سامراجی اداروں کو ضبط کر کے مزدوروں کے جمہوری کنٹرول اور انتظام میں دینا۔
نچکاری اور ڈاؤن سائزنگ کا مکمل خاتمہ۔ تمام سامراجی قرضوں اور اداروں کی منگلی۔ سامراجی جبر
کے خلاف جدوجہد کو طبقاتی بنیادوں پر منظم کرنا۔

غریب کسان

تمام جاگیرداروں کی مراعاتوں میں ختم۔ اجتماعی کاشتکاری کا فروغ اور جدید ٹیکنیکی بنیادوں پر زرعی انقلاب

نوجوان

روزگار کی ضمانت یا 10,000 روپے بے روزگاری الاؤنس۔ طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ اور تمام سطحوں پر
مفت تعلیم۔ طلبہ یونین سازی پر عائد پابندی کا فوری خاتمہ۔ 16 سال کی عمر میں ووٹ کا حق۔

خواتین

تمام رجعتی قوانین کا خاتمہ۔ محنت کش خواتین کو تمام شعبوں میں مساوی حقوق اور نمائندگی۔
ننگی کے دوران تنخواہ سمیت 16 ماہ کی رخصت۔ گھر بلوار صنعتی محنت میں تفریق کا خاتمہ۔

مذہبی اقلیتیں

مذہبی اقلیتوں کو برابری کے حقوق۔ سماجی و ثقافتی تعصب اور جداگانہ طریق انتخاب کا خاتمہ۔
ریاست کو مذہب سے علیحدہ کرنا۔

قومی مسئلہ

مظلوم قوموں کے حق خود ارادیت کا تسلیم کئے جانا اور قومی آزادی کی تحریکوں کو طبقاتی جدوجہد سے
منسلک کرتے ہوئے برصغیر کی رضا کارانہ سوشلسٹ فیڈریشن کا قیام جو تمام قومی و ثقافتی حقوق کی
ضامن ہوگی۔

فوج

فوج میں کمیشن سسٹم کا خاتمہ۔ افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہیں اور مراعات مساوی ہونا تمام افسروں
کا سپاہیوں کی کمیٹیوں کے ذریعے انتخاب۔ ایٹمی اور روایتی ہتھیاروں کا خاتمہ۔

خارجہ پالیسی

خارجہ پالیسی کی طبقاتی بنیادوں پر استواری۔ افغانستان سمیت دوسرے ممالک میں مداخلت اور رجعتی
ملاؤں کی حمایت کا خاتمہ۔ سامراجی مگرگشی اور قومی شائستگی طرز کی خارجہ پالیسی کا مسترد کئے جانا۔
محنت کشوں کو بین الاقوامی تحریک سے منسلک کرتے ہوئے عالمی سوشلزم کی جدوجہد کو تیز کرنا۔

